وادیٔ قاف

مسز عبدالقادر

ناشر

اُردو بک سٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

بار اوّل سنہ ۱۹۴۶ء

بار دوم سنہ ۱۹۴۸ء

بار سوم سنہ ۱۹۵۲ء

بار چہارم سنہ ۱۹۵۴ء

بار پنجم (نظرثانی کے بعد)

قیمت تین روپے

مطبوعہ

اِستقلال پریس لاہور

اُن مناظر کے نام —

جو میری افسانوی عمارات کے سنگِ بنیاد رہیں

فہرس

ربابہ

۱

میرے ابّا محکمہ جنگلات میں افسر تھے۔ سات سال کے بعد ان کی تبدیلی پھر رانی کھیت ہوگئی۔ میری امّی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا کیونکہ ابھی مجھے میٹرک پاس کیے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی دیرینہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔ امّی اور ابا دونوں رانی کھیت کے مشتاق تھے۔ وہ دونوں اکثر رانی کھیت کے مصفا چشموں شفاف ندیوں اور گہری گہری پن چکیوں کی ڈھلوان چھتوں پر سے گزرتی ہوئی پانی کی جھالروں اور سبز پوش جنگلوں کی تعریف میں رطب اللّسان رہتے تھے۔ ان

کا مخاطب ہمیشہ چچا نقی ہوتا تھا جو سُنے سنائے نظاروں سے متاثر ہو کر جھومنے لگتا۔

چچا نقی صرف میرا ہی چچا نہ تھا، وہ تو امّی اور ابّا کا بھی چچا تھا! بلکہ ان کے اجداد کا بھی!! یا دوسرے لفظوں میں جگت چچا تھا، غرضیکہ یہ ہمارے ہی کنبے کا ایک فرد مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس کا چچا ہے۔ یہ بہت نیک دل آدمی تھا۔ کنبہ بھر اس کی عزت کرتا تھا۔

یہ شخص مصوّر تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصّہ ہندوستان سے باہر گزرا تھا مگر اب قریباً پانچ سال سے وہ اپنے وطن واپس آ گیا تھا اور ہمارے پاس ہی رہتا تھا۔ چچا نقی کو مصوّری میں کمال حاصل تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں ہر طرح جامع اور مکمل ہوتی تھیں جن پر بارہا اسے انعام مل چکے تھے۔

ہمارے گھر میں رانی کھیت جانے کی بڑے ذوق و شوق سے تیاریاں ہونے لگیں۔ صبح چائے سے فارغ ہوتے ہی امّی نے کہا۔

"مجید۔ آج ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

میں نے کہا "فرمایئے"

انہوں نے کہا۔ ربابہ کے لئے چوڑیاں لانی ہیں۔

ربابہ کا نام سنتے ہی میں لرز گیا کیونکہ مجھے ربابہ سے بے حد نفرت تھی۔ ربابہ کا خیال آتے ہی میں نے فوراً اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جس پر اس کے کاٹنے کے زخم کا گہرا نشان موجود تھا۔ اس کے بعد میری نظر کلائی پر پڑی۔ یہاں بھی ایک داغ

اس کی خونخواری کا شاہد تھا۔ اس کے علاوہ متعدد جگہوں پر اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کے کئی نشان صاف نظر آتے تھے۔

غرضیکہ رانی کھیت جانے کی خوشی ربابہ کے ذکر ہی سے خاک میں مل گئی۔ میں چپکے سے اپنے کمرے میں چلا آیا اور سوچنے لگا کہ کیا پھر اس درندہ صفت غصیلی بندریا سے مجھے سابقہ پڑے گا۔ وہ قابلِ نفرت کبڑی لڑکی پھر مجھے ستائے گی۔ کبھی اپنے والدین پر غصہ آتا تھا کہ کیوں میری امی اس کی زرد رُو اور اپاہج ماں سے اتنی محبت کرتی ہے اور ابا کیوں اس کے خشک چہرے والے باپ سے میل جول رکھتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد پھر مجھے امی کا ہی نادر شاہی حکم ملا۔ گو میں ربابہ کا نام بھی سننے کا روادار نہ تھا تاہم امی کی حکم عدولی میری طاقت سے باہر تھی۔ میں نے بے دلی سے بازار کا راستہ لیا۔ جاتے وقت امی نے تاکید کی کہ چوڑیاں بہت عمدہ اور نفیس ہوں۔ ایسی ویسی نہ اُٹھا لانا۔

امی کے حکم کے مطابق سارا بازار چھان کر میں نے بہت خوبصورت چوڑیاں خریدیں مگر انہوں نے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا کر کہا۔

"اے ہے یہ کیا"

میں نے تنک کر کہا "اگر ان سے اچھی آپ کو کہیں سے مل جائیں تو میرا ذمہ"۔
امی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "بے شک اچھی تو ہیں۔ مگر کیا وہ انہیں

انگلیوں میں پہنے گی۔ یہ کس طرح اسے پوری آئیں گی"۔

میں نے چڑ کر کہا "آپ بھی یونہی نقص نکالنے لگیں۔ وہ چھوٹی سی بندریا تھی ہے اور کلائیاں اس کی اتنی سوکھی ہوئی ہیں جیسے بانس کی تیلیاں۔ یہ چوڑیاں تو اس کے گلے میں بھی پوری آئیں گی"۔

امّی نے ہنستے ہوئے کہا "مجید میں نہیں جانتی کہ تمہیں امتحان میں پاس کس احمق نے کیا"۔

میں نے آزردگی سے کہا "کیوں"۔

امّی نے کہا "بیٹا کچھ خیال تو کرو۔ تم نے تو اسے آج سے سات سال پہلے دیکھا تھا۔ اگر وہ اس وقت چھوٹی تھی تو تم بھی اس وقت بچے ہی تھے۔ اب تم ماشاءاللہ اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ تو کیا وہ ابھی تک اتنی ہی چھوٹی ہو گی۔

امّی کی بات سنتے ہی میں سہم گیا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا اور ساتھ ہی خطرہ بھی بڑھ گیا کہ جو لڑکی بچپن میں اتنی زبردست تھی، بڑی ہو کر خدا جانے کس قدر خونخوار ہو چکی ہو گی۔ غرضیکہ میں متردد ہو کر اپنے زخم کے نشان کو دیکھنے لگا۔ امّی نے کہا۔

"اب سوچتے کیا ہو۔ جا کر بارہ سالہ لڑکی کے ناپ کی چوڑیاں لاؤ"۔

میں خاموش رہا۔ امّی نے دوبارہ کہا۔

"مجید چپ کیوں ہو گئے ہو۔ بات بات پر بگڑنا اچھا نہیں ہوتا"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔"امّی میں بگڑا تو نہیں البتہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہوں کہ رانی کھیت نہ جاؤں"۔

اس پر امّی کو فکر لاحق ہوا کہ یہ کہیں رانی کھیت جانے کا ارادہ ہی ترک نہ کر دے۔ لہذا مجھے پچکار کر کہنے لگیں۔

"آخر اتنے بزدل کیوں ہو رہے ہو"۔

میں نے کہا"بزدل تو میں اسی وقت سے ہوں جب سے کہ ربابہ کا نام سنا ہے۔ مگر اس کے بڑا ہو جانے کی خبر سن کر خوفزدہ ہو گیا ہوں"۔

امّی نے کہا"ناحق خوفزدہ ہوتے ہو۔ آخر وہ کوئی ہوّا تو نہیں ہے"۔

میں نے مظلومانہ انداز سے کہا۔ امّی کیا آپ کو یاد نہیں کہ وہ کتنی خونخوار اور وحشی تھی۔ قرب وجوار کی ساری آبادی کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کس طرح وہ بات بات پر اپنا نوکیلا اور سخت پنجہ مار کر گوشت نوچ لیا کرتی تھی۔ اور کبھی دانتوں سے بوٹیاں اڑا لیتی تھی۔ دیکھئے میرے جسم پر کئی نشان ابھی تک اس کی ستمگری کی گواہی دے رہے ہیں"۔

اس پر امّی نے مسکرا کر کہا۔

"مجید بچّوں کی سی باتیں نہ کرو۔ اب بڑی ہو کر تو وہ سمجھدار ہو گئی ہو گی نہ کہ زیادہ وحشی۔ یوں تو بچپن میں سب ہی شریر ہوتے ہیں مگر وہ ذرا زیادہ شوخ تھی۔ دوسرے اب تم لوگوں کا پہلے کی طرح بے تکلفانہ میل جول بھی تو نہیں ہو گا کیونکہ اب تم

دونوں نام خدا جوان ہو چکے ہو۔"

میں نے امّی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

۲

رانی کھیت میں محکمہ جنگلات کا دفتر ایک خوبصورت جنگل کے کنارے واقع تھا جس کے قریب ہی داہنے بازو پہ فارسٹ آفیسر کی رہائش کے لئے سرکاری بنگلہ بنا ہوا تھا اور اس بنگلے کے پچھواڑے چودہ پندرہ فٹ نیچے گہرائی میں ایک دلفریب گھاٹی پر ڈاکٹر طارق کی کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی بہت بڑی اور خوبصورت تھی جسکی بالائی منزل پر ایک بڈھا بدصورت انگریز ڈاکٹر رہتا تھا جو تقریباً گوشہ نشین تھا اور ہر وقت اپنے دارالعمل ہی میں گھسا رہتا تھا۔ نچلی منزل میں خود ڈاکٹر طارق معہ فیملی کے متمکن تھا۔

طارق ایک ریٹائرڈ فوجی ڈاکٹر تھا اور لمبی لمبی مونچھوں والا ایک خشک رو آدمی تھا۔ اس کی گہری اور تیز نگاہوں سے تلخی اور سخت گیری نمایاں تھی۔ یہ شخص میرے ابّا کا دوست تھا اور اس کی بیوی جمیلہ جو ایک کمزور اور یرقان زدہ عورت تھی امیری امّی کی سہیلی تھی۔ جمیلہ کے پاؤں کو کوئی ایسا مرض تھا جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ اس لئے وہ ہر وقت ایک پہیّہ دار کرسی پر بیٹھی رہتی اور بوقت ضرورت اسے اِدھر اُدھر گھما کر لے جایا کرتی تھی۔

ربابہ انہی لوگوں کی نورِ نظر تھی۔ آج سے سات سال پہلے جب ہم لوگ رانی کھیت میں رہتے تھے اس وقت ربابہ پانچ سال کی تھی مگر تین سال سے زیادہ کی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس لڑکی کے جسم کا بالائی حصہ ضرورت سے زیادہ لمبا اور ٹانگیں بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی پیٹھ کبڑی، گردن کوتاہ، سر چھوٹا اور جسم کے تمام اعضاء نوکیلے اور ٹیڑھے تھے البتہ چہرہ نہایت خوبصورت تھا۔ مگر خدا کی پناہ اس چہرے پر آنکھیں اتنی بدنما اور متوحش تھیں جنہوں نے اس کے حسین چہرے کو بھی مکروہ بنا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایسی درندگی اور خونخواری ظاہر ہوتی تھی کہ انسان خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ غصے کے وقت اس کی آنکھوں کی پتلیاں نہایت خطرناک طور پر پھیلنے اور سکڑنے لگتیں۔

یہ لڑکی بڑی سُرعت سے درختوں پر چڑھ جایا کرتی اور شاخوں پر بے خوف دخطر کودتی پھلانگتی رہتی تھی۔ یہ مزاج کی اتنی کڑوی اور زہریلی تھی کہ ملازمین کے علاوہ اردگرد کے رہنے والے پہاڑی بچے بھی اس بلا سے پناہ مانگتے تھے۔ غصے کے وقت وہ جھپٹ کر اپنا آہنی اور نوکیلا پنجہ اس طرح مارتی کہ اس کی سخت اور مہین انگلیاں سوئیوں کی طرح گوشت میں پیوست ہو جاتیں اور وہ فوراً بوٹی اڑا کر لے جاتی اور اکثر دانتوں کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتی۔ میں ان دنوں نو سال کا تندرست اور قدآور لڑکا تھا تاہم اس کے جلّادانہ وار مجھ پر بھی ہوتے رہتے تھے۔ اس کی ان خونخواریوں کی وجہ سے اُس کا باپ اس پر بہت سختی کرتا تھا

چنانچہ ایک دفعہ جب اس نے ایک غریب گوالے کے لڑکے کو کلیجے پر سے نوچا تو گوالے نے ڈاکٹر طارق سے فریاد کی جس کی سزا میں ڈاکٹر نے اسے ٹکٹکی سے باندھ کر تمام دن اُلٹا لٹکائے رکھا تھا۔

یہ تھے رباربہ کے حالات جو میری پریشانیوں میں اضافہ کا باعث بن رہے تھے۔ آخر کار اسی کشمکش میں وہ دن بھی آگیا جب ہم لوگ رانی کھیت روانہ ہوئے۔ ہماری پیشوائی کے لئے ابا کے چند ایک دوست موجود تھے جن میں ڈاکٹر طارق بھی تھا۔

بنگلے کی صفائی ہونی تھی اور سامان وغیرہ ترتیب سے لگوانا تھا اس لئے امی ڈاکٹر کے ہاں ٹھہریں۔ ابا اور میں نوکروں سے بنگلے کی درستی کراتے رہے اور شام کے قریب جب ابا ڈاکٹر طارق کے ہاں جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ چلنے کا حکم ملا۔ ناچار میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ڈاکٹر طارق کی کوٹھی دور تو تھی نہیں صرف ایک لمبا سا زینہ طے کر کے نیچے جانا تھا۔ ڈاکٹر طارق اپنے احاطے میں منتظر تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر نرمی اور آنکھوں میں تبسم تھا۔ لہٰذا میرے دل میں اس کے متعلق جو تنفر تھا، آج کسی حد تک زائل ہو گیا۔

وہ ہمیں کمرے میں لے گیا جہاں امی کے پاس اس کی بیوی جمیلہ اپنی مخصوص پہیئے دار کرسی پر متمکن تھی۔ وہ مجھے بہت محبت سے ملی۔ آج اسے بھی میں نے اچھی طرح اور غور سے دیکھا۔ گو وہ مرض کی وجہ سے بالکل ہلدی جیسی بن رہی تھی تاہم

کافی حسین تھی اور بہت ہی بامحبت خاتون تھی۔ اسی وقت ابّا نے پوچھا "ربابہ کہاں ہے؟"

امّی بولیں "ابھی تک تو یہیں تھی۔ اس وقت شاید باہر جھولا جھول رہی ہوگی۔ اس کو جھولنے کا بہت شوق ہے۔"

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک خوش رو اور خوش اندام الھڑ سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کے بر میں سفید کھدر کا گھٹنا تھا گلے میں سفید کھدر کی سیدھی سادھی قمیض، اور پاؤں میں معمولی سی چپل۔ یہ لڑکی سر سے ننگی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں میں سیدھی مانگ نکال کر پیچھے چوٹی گوندھی گئی تھی جس میں سیاہ موباف پڑا تھا۔ اس کا وجود زیورات یا کسی دوسری آرائش سے بالکل مبرّا تھا۔

"لیجئے ربابہ بھی آگئی"۔ امّی نے ابّا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ربابہ جو طفلانہ شوخیوں سے ایک وحشی ہرنی کی طرح بے تحاشہ چوکڑیاں بھرتی ہوئی داخل ہوئی تھی، اندر آتے ہی سہم گئی۔ اس کے پاؤں خود بخود رک گئے اور وہ کچھ عجیب انداز سے اپنے باپ کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ میں نے بھی ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر کے چہرے پر وہی روکھاپن اور آنکھوں سے سختی جھلک رہی تھی۔ اب میں سمجھا کہ ڈاکٹر کی خشونت صرف ربابہ کے لئے مخصوص ہے۔

ابّا نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "ادھر آؤ بیٹی شرماتی کیوں ہو۔"

مگر ربابہ وہیں کھڑی رہی اور آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگی۔ ڈاکٹر اُسے

برابر گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ آخر وہ یک دم اپنے خیال سے چونکی اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر سلام کو اٹھا اور پھر کچھ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ ابّا نے اسے گود میں بٹھا لیا۔

ربابہ کو دیکھ کر میں انتہائی متحیر ہو رہا تھا کہ ربابہ کے جسم میں اس قدر تغیر کس طرح واقع ہوا۔ اس کے ٹیڑھے اور نوکیلے اعضاء کس طرح سیدھے ہوئے ٹانگیں کس طرح لمبی ہوگئیں اور کبڑی پیٹھ کس طرح ٹھیک ہوئی۔ گو وقت بچپن کو جوانی میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اور جوانی کا خون بدصورتی کو بھی خوبصورتی میں تبدیل کر سکتا ہے مگر جسمانی ساخت کو تو کوئی چیز بھی نہیں بدل سکتی۔ غرضیکہ ربابہ میرے لئے ایک عقدۂ لاینحل بن گئی —— بلکہ مجھے اس کے ربابہ ہونے میں بھی شک گزرنے لگا۔

ابّا پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور وہ اظہار خوشنودی پر ان کا دوسرا ہاتھ سونگھ رہی تھی۔ اچانک اس کی نگاہیں ڈاکٹر کی نگاہوں سے ملیں جن سے غیظ و غضب کے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ فوراً سنبھلی اور اس نے جھٹ ہاتھ سونگھنا بند کر دیا۔ پھر تھوڑے وقفہ کے بعد نہایت آہستگی سے ان کی گود سے نکل کر ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ابّا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ربابہ۔ یہ تمہارا بھائی مجید ہے۔ تم دونوں بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے کیا تم اسے پہچانتی ہو۔"

ربابہ نے نفی میں سر ہلایا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اب اس کی آنکھوں کو دیکھ

کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ربابہ ہے کیونکہ جسم کے دوسرے حصے تو تبدیل ہو چکے تھے مگر آنکھیں بالکل ویسی ہی تھیں۔ ان سے بدستور وحشت اور درندگی نمایاں تھی۔

ابّا نے پوچھا "بیٹی سکول جاتی ہو؟"

اس نے کہا "جی ہاں۔"

ابّا نے کہا "کس کلاس میں ہو۔"

وہ ابھی کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ جمیلہ بول اٹھی "ابھی تک تو دوسری ہی میں ہے غبی کہیں کی۔"

اس پر اس نے اپنی ماں کو نہایت خطرناک نگاہوں سے گھور کر دیکھا اور ساتھ ہی اس کا نازک پنجہ اس طرح اُٹھا جیسے نوچنے کے لئے اُٹھایا گیا ہو مگر فوراً ہی کسی خیال کے ماتحت اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے گر گیا اور بے بسی کے طور پر اپنے ہونٹ زور زور سے چبانے لگی حتیٰ کہ ان میں سے خون نکل آیا۔

عین اسی وقت ڈاکٹر طارق کھنکارا۔ ربابہ اشارہ پا کر کانپ گئی۔ اس نے ہونٹ چبانا چھوڑ دیا اور رومال سے ہونٹوں کو پونچھ کر خاموش بیٹھ گئی۔ بغرضیکہ امّی اور ابّا باتوں میں مشغول رہے مگر میں ڈاکٹر طارق کی طرف ہی متوجہ رہا جو ذرا ذرا سی لغزش پر ربابہ کو فہمائش کرتا جاتا تھا اور ربابہ بھی گویا اشاروں پر چلنے والی مشین معلوم ہوتی تھی۔

۳

دوسرے دن ہماری کوٹھی آراستہ ہوگئی۔ امّی اپنے گھر آگئی۔ مگر چونکہ ان کے احاطے سے احاطہ ملا ہُوا تھا اس لئے ہر وقت کا ساتھ تھا۔ گو خالہ جمیلہ اپنے مفلوج پاؤں کی وجہ سے ہمارے گھر کبھی نہ آتی تھی مگر ربابہ تو ہر وقت موجود رہتی اور امّی بھی ان کے گھر آتی جاتی رہتی تھی۔

ربابہ گو بارہ سال کی تھی مگر بمشکل دس سال کی دکھائی دیتی تھی۔ بالکل معصوم، بھولی بھالی، اپنی جنسی ساخت سے قطعاً بے خبر اور منزلِ شباب سے کوسوں دور۔ اس کے عادات و اطوار بہت کچھ سدھر چکے تھے۔ گو اب بھی اُس سے غیر انسانی حرکتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں تاہم زیادہ نقصان دہ ثابت نہ ہوتی تھیں۔ لیکن اس کی ڈراؤنی آنکھوں سے مجھے اب بھی بدستور نفرت تھی۔ اس کا زیادہ آنا جانا مجھے قطعاً ناپسند تھا۔ مگر وہ ایسی نڈر لڑکی تھی کہ خواہ مخواہ میرے کمرے میں گھس آتی اور فضول باتوں سے مجھے پریشان کیا کرتی۔ چنانچہ ایک دن سہ پہر کو جب میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا اور امّی ان کے گھر میں تھیں تو دبے پاؤں میرے کمرے میں آگھسی اور بڑی چاپلوسی سے کہنے لگی۔

"بھیا آج میری ایک بات مانو۔"

میں نے بیزاری سے کہا۔ "کیا"۔

وہ کہنے لگی "آج چوری چوری مجھے جنگل کی سیر کرا لاؤ"۔

میں نے تعجب سے کہا "چوری چوری کیوں"۔

اُس نے لجاجت سے کہا "کیونکہ میرا سیر کو جانا حکماً بند ہے"۔

میں نے کہا "کس وجہ سے"۔

اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی اور مجھے کنکھیوں سے دیکھنے لگی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ خود بخود کہنے لگی۔

"مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس لئے میرا سیر کو جانا بند کر دیا گیا"۔

"کس قسم کی غلطی" میں نے پوچھا۔

ربابہ کہنے لگی "دو تین مہینے ہوئے کہ ایک دفعہ میرے سکول کی استانیاں سب لڑکیوں کو ساتھ لے کر باہر پکنگ پر گئیں۔ جہاں پہاڑوں میں لمبی لمبی اندھیری کوٹھڑیاں تھیں لڑکیاں کہتی تھیں کہ ان میں شیر اور ریچھ رہتے ہیں۔ انہی کو کھوہیں کہتے ہیں۔ میں نے کتاب میں شیر اور ریچھ کی تصویر کئی بار دیکھی تھی اب ان کے گھر دیکھ کر میرے دل میں بڑا شوق پیدا ہوا کہ اصلی شیر اور ریچھ ضرور دیکھوں گی۔ لیکن دن کے وقت تو کبھی موقع نہ ملا مگر ایک دفعہ رات کو جب امّی اور ابّا سو گئے تو چپکے سے باہر نکل گئی اور کھوہوں میں جا کر شیروں اور ریچھوں کو تلاش کرنے لگی مگر وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھے کھوہیں سب خالی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ پھر شاید موقعہ نہ مل سکے۔ اس لئے ان کا انتظار کر لینا چاہئے۔ ممکن

ہے وہ آجائیں۔"

میں نے تعجب سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تو کیا تم کو کھوہوں سے ڈر نہ لگا۔"

اس نے سادگی سے جواب دیا "نہیں ڈر کیا تھا۔ مگر ظلم تو یہ ہوا کہ مجھے وہیں نیند آ گئی اور میں ایک کھوہ میں بے خبر سو گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو کھوہ میں کچھ اجالا ہو رہا تھا اور ابا میرے قریب کھڑے بوٹوں کی نوکوں سے مجھے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ ان کے ہمراہ دو ملازم بھی تھے۔ ان کو دیکھ کر میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور دم سادھ لیا۔ آخر کار ابا کے اشارے پر ملازم مجھے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے گھر لے گئے جہاں ابا نے بری طرح مجھے ہنٹر سے پیٹا اور بعد ازاں بڈھے ڈاکٹر کے حوالہ کر دیا جس نے کھال ہی ادھیڑ کر رکھ دی۔"

ڈاکٹر جوڈی کے مارنے کا سن کر مجھے بہت اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا "ارے ڈاکٹر جوڈی بھی تم کو مارتا ہے۔"

اس نے روندھے ہوئے گلے سے "ہاں" کہا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے اور سکڑنے لگیں جن سے انتہائی شقاوت اور انتقامی جذبہ جھلک رہا تھا اور غیظ و غضب سے اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنے نوکیلے پنجے کو دیکھا پھر اپنے ہونٹ زور زور سے چبانے لگی ——— میں اس کی پُرخطر نگاہوں سے بہت گھبرایا۔ جب اس کا جوش کچھ کم ہوا تو بولی۔

"بھیّا اتنی سزا دے کر بھی ان کا جی نہیں بھرا اور اس دن سے رات کو مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیتے ہیں۔ اب دن کو بھی سیر کا حکم نہیں"۔

میں نے کہا "بھئی پھر تم نے خود ہی اپنی آزادی کھو دی ہے۔ تم نے حرکت ہی ایسی کی کہ وہ سختی پر مجبور ہو گئے"۔

اُس نے کہا "مگر بھیّا اب تو میں نے توبہ کر لی ہے پھر بھی انہیں رحم نہیں آتا"

میں نے اپنا پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا میں اپنی امّی سے تمھاری سفارش کر دوں گا۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جایا کریں گی"۔

اُس نے مچل کر کہا "بھیّا اُن سے نہ کہنا"۔

میں نے پوچھا "کیوں"۔

ربابہ کہنے لگی وہ پہلے تو مجھے خود ہی ساتھ لے جاتی تھیں لیکن پچھلے ہفتے میں جب ان کے ساتھ تھی تو وہ راستے میں ایک ٹریڈ میں بنچ پر بیٹھ کر کھیل کا نظارہ کرنے لگیں۔ اتفاقاً اسی وقت میری نظر سامنے ریلوند کے ایک درخت پر پڑی جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک چھتہ لگا ہوا تھا۔ یوں تو شہد ہمارے گھر میں بھی بہت موجود تھا مگر پھر بھی اُس چھتے کو دیکھ کر میرا دل بہت للچایا۔ میں خالہ کی آنکھ بچا کر فوراً درخت پر چڑھ گئی۔ مگر جونہی میں نے چھتے کو ہاتھ لگایا مکھیاں بھنبھنا کر مجھے چمٹ گئیں اور بدحواسی سے میری چیخ نکل گئی۔ ادھر خالہ کو جب پتہ

لگا تو انہوں نے دہائی مچائی۔ خالہ کا شور سن کر مجھے اپنی تکلیف یاد نہ رہی اور میں بڑی تیزی سے نیچے اُتر آئی پھر بھی خالہ نے مجھ پر بہت لعن طعن کی اور واپس گھر لے آئیں۔ مگر گھر پہنچتے پہنچتے میرا منہ سر سُوج گیا۔ اس پر سزا کا خیال سوہانِ روح تھا۔ لیکن خالہ نے مجھے سزا سے بچا لیا کیونکہ انہوں نے ابا سے بہانہ کیا کہ ہمارے احاطے میں شہد کی مکھیاں چھیڑی ہوئی تھیں جنہوں نے اس بے چاری کو کاٹ لیا ہے۔ سزا تو ٹل گئی لیکن خالہ نے عہد کر لیا ہے کہ مجھے کبھی ساتھ نہ لے جائیں گی"۔

میں نے کہا "تو اب میں کیا کروں تم نے تو اپنے سارے راستے خود ہی بند کر لئے ہیں"۔

ربابہ نے جواب دیا "نہیں ابھی ایک راستہ کھلا ہے"۔

میں نے کہا "وہ کونسا"۔

ربابہ کہنے لگی "آپ مجھے ان لوگوں سے چوری چوری لے جایا کریں"۔

میں نے کہا "کیوں مجھے کیا غرض پڑی ہے مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا"۔

میرا جواب سُنکر وہ منتیں کرنے لگی۔ اور پھر نا امید ہو کر ٹسوے بہانے لگی۔ بس رونا شروع کیا تو ختم کرنے کا نام ہی نہ لیا۔ میں بہت بیزار ہُوا اور اس بلا سے چھٹکارا محال ہو گیا۔ ناچار اس کی سینہ زوری سے مجبور ہو کر اُسے سیر کے لئے ساتھ لے جانا پڑا۔

راستے میں ہم دونوں چُپ چاپ جا رہے تھے کہ اُس نے یکایک اُچھل کر

بے چینی سے کہا "اوہ"

میں نے اپنے خیال سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سراپا التجا بن کر کہنے لگی۔ "میرے اچھے بھیّا میری ایک بات اور مان لو"

میں نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور خفگی سے آگے بڑھنے لگا مگر اس نے راستہ روک کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور نہایت بے ہودگی سے انہیں چاٹنے لگی۔ اس کے وحشی پن پر مجھے سخت گھن آئی اور میں نے نفرت سے اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

اس نے میری برافروختگی کی بالکل پروا نہ کی۔ اور میری ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی "میرے اچھے بھیّا مان بھی جاؤ"۔

میں نے اس کے بار بار دِق کرنے پر جھلا کر کہا "کچھ کہو گی بھی یا یونہی تنگ کئے جاؤ گی"۔

ربابہ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس پر چڑھنے کی اجازت دو"۔

میں نے خشک لہجہ میں کہا "کیوں کس لئے"۔

اس نے کہا "وہاں چیل کا گھونسلہ ہے"۔

میں نے کہا "گھونسلہ ہے تو ہوا کرے تمہیں اس سے کیا مطلب"۔

اُس نے ڈھیٹ پن سے کہا "بھیّا میں چیل کے انڈے پٹوں گی وہ بڑے مزے

کے ہوتے ہیں"۔

اس کی اس مکروہ خواہش پر میرا جی متلا گیا اور اُسے حقارت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے تھوہ تھوہ کرنے لگا۔ مگر خدا کی پناہ وہ کب ٹلنے والی تھی اس نے دوبارہ پھر اسی گندے شوق کا اظہار کیا۔ اب تو مجھے بڑا ہی طیش آیا اور میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور زبردستی دھکیل کر گھر واپس لے آیا۔ اس دن سے وہ ایسی میری نظروں سے گری کہ میں اسے کتے سے بھی زیادہ نجس اور ذلیل سمجھنے لگا اور اس کی ناگوار آمد و رفت نے مجھے رانی کھیت سے متنفر کر دیا۔ چنانچہ جب میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں اس طرح وہاں سے نکلا جیسے قید خانہ سے چھٹکارا ملا ہو۔

۴

سردیاں گزر گئیں۔ موسم بہار کی چھٹیاں قریب تھیں۔ امّی کے خط پر خط آ رہے تھے کہ بہار کی چھٹیوں کے ساتھ دس دن کی اور چھُٹّی لے کر رانی کھیت چلا آؤں۔ ادھر چچا نقی نے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ کب چھٹیاں ہوں گی۔ کس تاریخ کو ہوں گی۔ وہ میرے ساتھ رانی کھیت جانے والا تھا کیونکہ وہ ابّا کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں اب تک یہیں رُکا ہُوا تھا اور ان کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ لہٰذا اب وہ جلد وہاں پہنچنے کے لئے بے تاب تھا۔ خیر بادلِ نخواستہ مجھے

رانی کھیت جانا پڑا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ جنگل پھولے پھلے ہوئے تھے۔ خوشبوؤں کا طوفان امڈ رہا تھا اور چچا نقی جیسے دلچسپ آدمی کی رفاقت تو گویا سونے پر سہاگہ تھی۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ ان دنوں ربابہ کی آمد و رفت ہمارے گھر میں بند تھی۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑی کوفت تھی جو خود بخود دور ہو چکی تھی۔

غرضیکہ ان بے فکریوں اور قدرت کی رعنائیوں نے میرے دل و دماغ کو تر و تازہ کر دیا۔ میں بہار کے جو شیلے شباب اور مہکتی ہوئی رنگینیوں کی خوشہ چینیوں میں مصروف ہو گیا۔

میں اور چچا نقی صبح ناشتہ کر کے باؤلی پر چلے جاتے اور شام کو واپس آتے۔ دوپہر کا کھانا ہمیں ملازم وہیں پہنچا دیا کرتا۔ چونکہ چچا نقی انعامی مقابلے کے لئے تصویر بنانے کا ارادہ کر چکا تھا اور چاہتا تھا کہ بہار کی گود میں پلے ہوئے جنگلوں کے نشیلے حسن سے، معطر ہواؤں کی خمار آلودہ سانسوں میں، پھولوں کے رنگیں لبوں سے اور خوش رنگ حسین پرندوں کے فردوسی نغموں سے، رموزِ قدرت کا کوئی دقیق نقطہ حل ہونے پر اپنی تصویر میں کوئی خاص جدت پیدا کر سکے۔

کانونٹ کے سامنے دیوند کا گھنا جنگل تھا جس کے اختتام پر ایک بلند پہاڑ کے دامن میں ایک ابھری ہوئی چٹان سے مصفّا پانی کی دھاریں پھوٹ کر نیچے باؤلی میں گر رہی تھیں۔ یہ باؤلی پرانے وقتوں کی بنی ہوئی مختصر سی عمارت تھی یعنی

ایک معمولی سی سہ دری میں ایک حوض بنا ہوا تھا۔ یہ باؤلی سرخ پتھر کی تھی جس کے لمبوترے محراب کے سرے پر ترشول نصب تھا۔ اس باؤلی کی چھت اور ستون پانی کی افراط سے سیاہ ہو رہے تھے جو بلندی پر سے کئی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے اس جگہ باؤلی کی چھت پر پھیلتا تھا اور ترشول کی رکاوٹ اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے اِدھر اُدھر پھینک دیتی تو پانی کی جھالر محرابی صورت اختیار کر کے نیچے پتھروں پر گرتی جس کی مسلسل روانی سے ایک طویل اور غیر مختتم راگ ہمیشہ سے جاری تھا۔

غرضیکہ یہ دو رنگی باؤلی اس جنگل کی جان تھی اور اس چشمے کا پانی حوض سے نکل کر نالہ کی صورت میں سنہری اور روپہلی کنکروں کو جا بجا پرکھتا ہوا سیدھا کانونٹ کی بلند سنگین دیوار کے پاؤں میں جا کر ختم ہو جاتا اور ایک شگاف کے ذریعے کانونٹ کے باغ میں داخل ہوتا تھا۔ اس نالہ کے دونوں دامنوں پر دو وسیع خطے جنگلی گلاب کی جھاڑیوں سے بھرپور تھے۔ یہ خار دار جھاڑیاں اس قدر گنجان اور گھنی تھیں کہ ان میں سے انسان کا گذر محال تھا اس لئے یہ پھول انسانی دست درازی سے محفوظ رہا کرتے تھے اور بیزن بھر ان جھاڑیوں پر پھولوں کا غلاف چڑھا رہتا تھا۔ ان گلابی کھیتوں کے ارد گرد بنفشہ کے پھولوں کی قدرتی باڑسی بندھی ہوئی تھی جو بالکل اسی طرح دکھائی دیتی تھی جیسے دوشیزۂ بہار کی گلابی چندری میں بنفشئی رنگ کی سنجاف لگی ہو۔

چونکہ سیزن ابھی پوری طرح شروع نہ ہُوا تھا اور رانی کھیت کی سرزمین ہنوز سیاحوں سے بالکل پاک تھی اس لئے کوہسار کی پرسکون تنہائیوں میں سوئی ہوئی پھلواریوں کا فطری جمال کچھ آجکل ہی دیکھنے کے قابل تھا۔ چچا نقی نے یوں تو سارے رانی کھیت کو بے حد پسند کیا تھا مگر اس سیرگاہ پر تو اس کی جان جاتی تھی۔

انہی دلچسپیوں میں میری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ رانی کھیت میں میرا آخری دن تھا۔ میں اور چچا نقی بدستور چشمے کے قریب ایک چٹان پر بیٹھے تھے۔ میں بنسری بجا رہا تھا اور وہ تصویر کشی میں مصروف تھا۔ عین دوپہر تھی۔ سورج کی نورانی کرنیں خطۂ گل پر کندن کاری کر رہی تھیں۔ ریوند کے بانکے درختوں پہ دودھ جیسے سفید پھولوں کے گچھے آویزاں تھے۔ گویا فرشتوں کے زمردیں پروں میں زبرجد کے نگینے جڑے ہوں۔ ایک طرف دورنگی باؤلی کی چھت پر سے آنے والی آبِ رواں کی ہلکی سی جھالر محرابی سانچے میں ڈھل کر اس انداز سے نیچے کی طرف آ رہی تھی جیسے کسی راجکماری کے روشنی جھروکے کے دونوں جانب شفاف اور رپہلا ہوا کے قیمتی کوکلے لٹک رہے ہوں۔ سامنے سفید براق پانی کا نالہ الف کی صورت میں بہہ رہا تھا جیسے قلمِ قدرت نے ایک نورانی لکیر کھینچ کر رکھدی ہو۔ دوسرے کنارے پر نیلے آسمان کے نیچے جنگلی گلاب کا وسیع چمن سُرخ، گلابی پیازی اور زرد رنگ کے خوش نما اور شاداب پھولوں سے لدا ہوا تھا جو عام

پھولوں سے دو گنے تگنے بڑے، چمکیلے اور خوشبو میں بے مثل تھے۔

اس مسحور کن سماں میں درختوں پر جب کوئی بجر المستی سے چور چوں چوں چوں کی آواز بلند کرتا تو اس کی طلسمی آواز موجوں کی راگنی میں حل ہو کر میری بنسری کی تانوں میں ایک عجیب قسم کی پاکیزہ اور دلکش تاثیر پیدا کر دیتی کہ میں خود وجدانی کیفیتوں میں ڈوب جاتا۔

چھانقی عالم محویت میں اپنی تصویر پر تیزی سے برش پھیرنے لگا گویا وہ اس اچھوتے منظر کی تمام تر رعنائیوں کو صفحۂ قرطاس پر منقش کرنا چاہتا تھا۔ دفعتاً اس نے برش ہاتھ سے رکھ دیا اور کہنے لگا۔

"جنید! کیا کروں کئی دن سے اس کوشش میں ہوں کہ اس ارمی خطے کی تمام دلاویزیاں اس کاغذ پر نقش کر دوں اور ایسا کر بھی چکا ہوں مگر پھر بھی یہ دنیا سعنی اور بے بضاعت ہی رہتی ہے۔ اس میں وہ رنگینی نہیں پیدا ہوتی جیسی کہ میں چاہتا ہوں۔ لیکن اب میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ رنگین لمحات میں ایک ایسے حسن کی ضرورت ہے جس کی خاطر یہ تمام موجوداتِ ارضی بنائی گئی ہوں۔ جس کی دلچسپی کے لئے قدرت نے یہ بیش بہا خزانہ وقف کر رکھا ہو، جو ان جواہر ریزوں کو پرکھنے کا حامل ہو بلکہ خود بھی اسی تخلیق حسن کا ایک جز ہو۔"

میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو آپ کسی انسانی حسن کو اس ماحول کے رنگین تاروں میں جکڑ کر اس کاغذی پنجرے میں بند کر دینا چاہتے ہیں۔"

چچانقی نے کہا "بے شک اگر اس ارضی حسن کی ٹکر کا ہی کوئی انسانی حسن اس وقت میرے پیش نظر ہوتا۔ تو بس میدان میرے ہاتھ تھا۔"

میں نے مذاقاً کہا "تو میری ہی شبیہہ کا عکس اس میں کیوں نہیں بھر دیتے۔ میں بھی تو حسین ہوں۔"

چچانقی نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں ہاں تم بھی حسین ہو۔ لیکن تمہارا وجود خالص حسن کے خمیر سے تیار نہیں ہؤا۔ اس میں معمولی مٹی کی بھی ملاوٹ ہے۔ اس لئے تم میں وہ ساری خوبیاں نہیں جو ایسے موقع کے لئے مخصوص ہیں۔ مجھے تو اپنی تصویر کے لئے کسی فرشتے کا حسن درکار ہے یا کم از کم کسی ایسے انسان کا جو خالص حسن کے خمیر سے تیار شدہ ہو۔ اور نور کے رنگ و روغن سے مجلا کیا گیا ہو۔"

میں نے چڑ کر کہا "بہت خوب تو پھر آچکا فرشتہ اور بن چکی تصویر۔"

چچانقی نے اداسی سے کہا۔ "اچھا جو خدا کو منظور۔ آخر دنیا امید ہی پر تو قائم ہے"۔ اتنا کہہ کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر سرنگوں ہو گیا۔ جیسے مراقبہ میں ہو۔

عین اسی وقت یک دم ایک زبردست شوں کی آواز بلند ہوئی۔ جیسے کئی سانپوں کی پھنکار۔ چچانقی نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور بے ساختہ چلا اٹھا "اوہ حسن کا سیلاب"۔

میں نے فوراً چمن کی طرف دیکھا تو وسط چمن میں رنگین پروں والی تیتریوں

کانٹڑی دل فضا میں جھکمہ کا ٹنا دکھائی دیا۔ حیرت سے میری نظریں اس قدرتی کرشمے پر جم گئیں۔ شاید قدرت چچانقی کی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہ فیاضی برت رہی تھی۔ رنگ برنگی تیتریوں کا سیلاب اس طرح امڈ رہا تھا جیسے آتشبازی کے اناروں سے مختلف رنگوں کی پھلجڑیاں پھوٹ کر ہوا میں بلند ہو رہی ہوں۔

ہم دونوں سراپا شوق بنے ادھر دیکھ رہے تھے کہ اچانک پھر ایک نہایت سہانی گونج سنائی دی اور ساتھ ہی جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ گلاب کی جھاڑیوں سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا نکل کر ہوا میں کا دے کاٹنے لگا۔ ان کبوتروں کا رنگ سرسوں کے پھول کی طرح خوشنما تھا۔ ان کی کلغیاں اور پاؤں سیاہ رنگ کے تھے اور پروں پر بھی چوڑی چوڑی سیاہ دھاریاں تھیں۔

پیچھے رنگین تیتریوں کا غبار تھا۔ جس کے آگے ان شوخ رنگ ریشمیں پرندوں کی اڑان عجب سماں باندھ دیا۔ چچانقی جوش میں آکر کہنے لگا۔

"قدرت آج حسن کے سب نادر نمونے دکھانے پر تل گئی ہے۔ زمین پر جنت کے باسیوں کا ورود ہو رہا ہے۔ یہ سب جنتی مخلوق ہے۔ فرشتے بھی ضرور آنے والے ہیں۔"

ابھی یہ فقرہ اس کی زبان تک آیا ہی تھا کہ پھولوں کے گھنے اور گندھے ہوئے ایک کنج کو حرکت ہوئی اور پھولوں کے شگاف سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔ یہ

چہرہ اس قدر معصوم اور پُر تحمل تھا کہ ہم دونوں بے خودی کے عالم میں فرشتہ فرشتہ پکار اُٹھے۔

فرشتہ بالکل ساکت و صامت آنکھیں بند کئے پھولوں کے ہالہ میں اس طرح بیٹھا یا کھڑا تھا۔ جیسے نہایت دلجمعی، پورے سکون اور مکمل انہماک سے پھولوں کی خوشبو سونگھنے میں مصروف ہو۔ اس کا بشاش اور متبسم معصوم چہرہ جوار و گرد کے تاثرات سے بالکل بے نیاز تھا۔ پھولوں کے رنگین عکس سے گلگوں ہو رہا تھا۔

قدرت کے ان انوکھے عجائبات کو دیکھ کر ہمارے ذہن معطل اور حواس مختل ہو گئے اور بہت دیر تک فرشتہ فرشتہ کہنے کے سوا کوئی دوسرا لفظ ہماری زبان پر نہ آیا۔ آخر ایک ہلکے سے قہقہے کی گونج نے اس طلسم کو توڑا اور ساتھ ہی کسی نے بلند آواز سے کہا "فرشتہ نہیں بلکہ شیطان"۔

ہم ایک خوشگوار تعجب سے چونک اُٹھے۔ دیکھا تو امی ہمارے قریب کھڑی تھیں اور مسرت بھری نگاہوں سے اس چہرے کو تک رہی تھیں۔

پھولوں کے ہالہ میں گھرا ہُوا بشاش چہرہ یوں خود فراموشی کی حالت میں اس جگہ ٹکا ہُوا تھا۔ جیسے پھولوں کے لاکٹ میں دلہن کی تصویر جڑی ہوئی ہو۔ امی نے قدرے جھجکتے ہوئے انداز سے کہا۔

"توبہ آج تو اس بھتنی نے مجھے بڑا خراب کیا۔ کل چونکہ تمہیں جانا ہے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ دوپہر کا وقت تمہارے ساتھ ہی گزاروں۔ لہذا جب شرفو

کھانا لے کر آیا تو یہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی آئی۔ شامتِ اعمال اس کٹنی نے کہیں مجھے دیکھ لیا۔ اور دوڑتی ہوئی آگئی۔ حالانکہ بہت دنوں سے میں نے اپنے گھر میں اس کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ بس آتے ہی میرے قدموں میں بچھ گئی اور سسکنے لگی۔ ناچار مجھے ساتھ لانا پڑا۔ اب ہم لوگ پگڈنڈی کے راستے سے آرہے تھے یہ چمن دیکھتے ہی ادھر بھاگنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر یہ میرے ہاتھوں سے نکل کر ہوا ہو گئی۔ شرفو اس کے پیچھے دوڑا مگر یہ بے محابا پھلواری میں گھس کر ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔ اس کی نوچ کھسوٹ سے بچنے کے لئے ہی تو یہ تیتریاں بیچاری بھی پریشان ہوئیں اور یہ پرندے بھی اپنے گھونسلے چھوڑ کر دربدر ہو گئے۔ میرا تو خیال تھا کہ ابھی کانٹوں میں الجھ کر چیختی چلاتی ہوئی باہر نکلے گی مگر بھئی بڑی سخت لڑکی ہے۔ اب دیکھو تو سہی۔ خوشبو سے مست ہو کر کس ٹھاٹ سے پھولوں کے ہالہ میں متمکن ہے۔ گویا پریوں کی شہزادی پھولوں کے دریچے سے جھانک رہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے امّی نے فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ماحول کے زیرِ اثر مجھے امّی کی باتیں کچھ سمجھ میں نہ آئیں مگر جب انھوں نے بلند آواز اور تحکمانہ لہجہ میں اسے ربابہ کہہ کر پکارا تو میری آنکھوں سے بے خودی کا پردہ ہٹ گیا۔ تصوّر کی دنیا فوراً درہم و برہم ہو گئی۔ ماحول کا رنگین اور طلسمی بندھن یک لخت ٹوٹ گیا وہ پھولوں کے کنج کو چیرتی پھاڑتی اور پھولوں کی رنگین سطح کو تہ و بالا کرتی، نرم و نازک پنکھڑیوں کو بکھیرتی اور روندتی ہوئی، وحشیانہ انداز

سے باہر نکل آئی۔

وہی معمولی ربابہ وہی کھدر کی قمیض اور گھٹنا اس کے بدن پر تھا جو کانٹوں میں الجھنے سے تقریباً پھٹ چکا تھا۔ نازک اور پھولدار شاخوں کا ہالہ اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا جس کے کئی نوکیلے خار اس کی گردن میں بھی پیوست تھے۔

امی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ملامت کی اور بڑبڑاتے ہوئے اس کی گردن سے چبھے ہوئے کانٹے نکالنے لگیں۔

"توبہ اس لڑکی نے ہمیں کیسا اُلّو بنایا ہے"۔ میں نے جھلا کر کہا اور اس کی گردن میں چبھے ہوئے کانٹوں کو خوشی سے دیکھنے لگا۔ مگر اسے اپنے دکھتے ہوئے جسم کی مطلق پروا نہ تھی اور نہ ہی ملامت کا کچھ احساس۔ بلکہ وہ ابھی تک تمتماتے ہوئے چہرے اور للچائی ہوئی نظروں سے برابر اس کنج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

چچا نقی کے لئے یہ واقعہ ایک معمّہ تھا یا کسی پر اسرار ڈرامے کی عمیق کہانی آخر وہ نہ رہ سکا اور چلا کر کہنے لگا۔

"بھئی مجھے تو بتاؤ کہ یہ معصوم شخصیت کون ہے اور تم لوگ اسے کیوں ستا رہے ہو۔ اس جنگلی فرشتے کو ادھر میرے پاس لاؤ" جس پر میں نے ربابہ کو کان سے پکڑ کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔

"لیجیے یہ جنگل کا فرشتہ تو نہیں بلکہ جنگل کا بھوت ضرور ہے۔ ہم نے جو اسے ستایا

ہے اس کی آپ تلافی کر سکتے ہیں"۔ میں نے جل کر کہا۔

چھانقی نے چونکہ آج سے پیشتر ربابہ کو دیکھا نہ تھا۔ اس لئے وہ حقیقت حال سے آگاہ ہو کر اطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سوامی نے اسے بتایا کہ یہ ڈاکٹر طارق کی بیٹی ہے جو کہ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ یہ سن کر چھانقی بہت خوش ہوا۔ اس نے ربابہ کو گود میں بٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ ربابہ بھی نہایت بھولے پن سے اسے چمٹ گئی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ چھانقی پھر ایسے ہی ماحول میں ربابہ کی تصویر بنائے گا۔ خیر میں اس واقعہ کے دوسرے دن رانی کھیت سے چلا آیا۔

۵

رانی کھیت سے آئے مجھے دو مہینے گزر چکے تھے۔ جون کا مہینہ تھا۔ میں کالج سے واپس آیا تو میز پر امّی کا خط پڑا تھا جس میں لکھا تھا کہ "چھانقی کلکتہ گیا ہے کیونکہ اس نے ربابہ کی جو تصویر بنائی تھی اس پر اُسے سپیشل انعام ملا ہے اور وہ واپسی پر تمہارے پاس آئے گا۔ تم اس کے ساتھ رانی کھیت آجانا۔"

میں پہلے ہی موسم کی گرمی سے تھک رہا تھا اب ربابہ کی تصویر کی کامیابی کا حال سُن کر اور بھی راکھ ہو گیا۔

اس بات کو ابھی ہفتہ عشرہ ہی گزرا تھا کہ ایک اتوار کو خود چھانقی میرے پاس آ دھمکا۔

"کیوں بھئی مجید تم نے مجھے مبارک باد کا خط کیوں نہیں لکھا" اُس نے آتے ہی کہا۔

میں نے یونہی تجاہلِ عارفانہ سے جواب دیا "کاہے کی مبارک"۔

اس نے فخریہ لہجہ میں کہا "ارے کیا تمہیں خبر نہیں کہ میں نے ربابہ کی جو تصویر بنائی تھی اُس پر سپیشل انعام ملا ہے۔ یہ خبر تو اخباروں میں بھی چھپ چکی ہے"۔

میں خاموش رہا۔ چچا نقی کہنے لگا۔

"کیا تم مجھ سے کچھ ناراض ہو"

میں نے کہا "نہیں"۔

اس نے کہا "تو پھر مجھے مبارک کیوں نہیں دیتے"۔

اور مجبوراً ایک بناوٹی مسکراہٹ سے مجھے مبارکباد کی رسم ادا کرنی پڑی۔

اب چچا نقی مسکرا کر بولا "بھئی یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے خواہ مخواہ مبارک باد لینے آیا ہوں۔ نہیں مجھے تو تمہاری امّی نے تاکید کی تھی کہ واپسی پر مجید کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ لہٰذا میں تم سے دریافت کرنے آیا تھا کہ تمہاری چھٹیاں کب ہوں گی"۔

میں نے کہا "یکم جولائی کو"۔

چچا نقی نے کچھ بددلی سے کہا "یعنی دس دن کے بعد"۔

میں نے بے توجہی سے کہا "جی ہاں"

چچا نقی کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا "اچھا تو پھر ہم دونوں اکٹھے ہی رانی کھیت

چلیں گے۔ یہ چند دن کسی نہ کسی طرح گذار لوں گا۔"

میں نے کہا "بہت بہتر۔"

اس مرتبہ پھر ہم دونوں اکٹھے رانی کھیت روانہ ہوئے۔ مگر اس بار چچا نقی کی رفاقت سے مجھے کسی قسم کی خوشی اور فرحت حاصل نہ ہوئی کیونکہ اب میرے اور اس کے درمیان ربابہ حائل تھی، وہی قابلِ نفرت ربابہ جو مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور چچا نقی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ربابہ میں ابھی تک وہی بدتمیزی، نامقبولیت وحشیانہ انداز اور آنکھوں کی خوفناکی موجود تھی۔ میں اس کے میل جول سے بدستور گھبراتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ باہر سخت بارش ہو رہی تھی اور ہم لوگ کمرے میں آگ کے قریب بیٹھے تھے۔ اس وقت ربابہ ہمارے گھر موجود تھی اور میری ساتھ والی کرسی پر بیٹھی اپنی ٹانگوں کو زور زور سے ہلا رہی تھی اور میں اس کے اس فعل کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے سامنے والی کرسیوں میں سے ایک پر امّی بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھیں۔ دوسری پر چچا نقی بیٹھا ربابہ کے مصحفِ رخ کا مطالعہ کر رہا تھا اور کبھی کبھی سرسری نگاہوں سے مجھے بھی دیکھنے لگتا۔

اتفاقاً امّی کی نظریں اوپر کو اٹھیں تو ربابہ نے فوراً چوکنّا ہو کر ٹانگوں کی حرکت روک لی اور نہایت متانت سے سمٹ کر بیٹھ گئی۔ چچا نقی کو نہ جانے اس کی یہ ادا کیوں اتنی بھائی۔ اس نے اٹھ کر ربابہ کا منہ چوم لیا اور ہنستے ہوئے امّی سے کہنے لگا۔

"دیکھو رضیہ رباب مجید کے پاس بیٹھی ہوئی کتنی سجتی ہے۔ میں دیر سے ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں۔ نہایت موزوں جوڑی ہے۔ خدا چشم بد سے بچائے"۔ اس پر امی نے شوق بھری نظروں سے رباب کو دیکھا۔ پھر چچا نقی کو پرمعنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"اچھا جیتے رہیں زندگی رہی تو سب کچھ ہو جائے گا"۔

چچا نقی نے کہا "ڈاکٹر کا خیال کیا ہے"۔

امی نے کہا "اس کا تو پتہ نہیں مگر جمیلہ خود مجھے کئی بار ادھر توجہ دلا چکی ہے۔ مگر مجید کے ابا بچپن کے رشتوں کے خلاف ہیں۔ اس لئے مجید کے تعلیم سے فارغ ہونے تک کچھ کہنا سننا فضول ہے"۔

امی کے اس خوفناک ارادے سے آگاہ ہو کر میرے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اور بے حد و حساب آزردگی سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں بغیر سوچے سمجھے منہ لٹکا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مگر امی نے میری اس حرکت کو شرمیلے پن پر محمول کیا کیونکہ میں نے ان کے الفاظ صاف طور پر سنے۔ وہ فخریہ چچا نقی سے کہہ رہی تھیں۔

"دیکھو کتنا حیادار لڑکا ہے۔ ذرا شادی کا نام آیا اور لڑکیوں کی طرح بھاگ کھڑا ہوا ورنہ آجکل کے لڑکوں میں یہ بات کہاں"۔

امی کی غلط فہمی پر میرا دل بے اختیار بھر آیا اور میں کمرے میں پہنچ کر دیر تک روتا رہا۔ اس دن سے میری طبیعت کچھ سست اور برافروختہ سی رہنے لگی۔

حتیٰ کہ مجھے چھٹیاں گذارنا محال ہو گئیں۔ امّی نے کئی دفعہ اس پژمردگی کی وجہ پوچھی۔ گو میں چاہتا بھی تھا کہ ان سے سارا معاملہ بیان کر دوں تاکہ وہ اس خام خیالی سے باز رہیں مگر امّی کے ادب و لحاظ نے جو خوف کا درجہ رکھتا تھا، میری زبان میں تالا ڈال دیا۔

غرضیکہ خدا خدا کر کے چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں نے رانی کھیت سے نکل کر شکر کا کلمہ پڑھا۔ اس دن سے پھر کبھی بھول کر بھی رانی کھیت کا رُخ نہ کیا حتیٰ کہ اس تذکرہ کے بعد برابر تین سال تک میرے والدین رانی کھیت میں رہے مگر میں ہمیشہ چھٹیوں میں کوئی ایسا بہانہ تراشتا کہ وہ خاموش ہو جاتے اور سردیوں میں چونکہ امّی خود لاہور آ جاتی تھیں اور ابّا بھی اکثر چھٹیاں لے کر آتے رہتے، اس لئے یہ حیلے بہانے کارگر ہو رہے تھے اور انہیں کچھ زیادہ احساس نہ ہوا۔ اس کے بعد جب ابّا رانی کھیت سے تبدیل ہوئے تو میری جان میں جان آئی۔

وقت یونہی گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ میں تعلیم سے فارغ ہو کر ملازم ہو گیا تو ایک دن ابّا نے مجھ سے شادی کا ذکر چھیڑا۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ جب تک میری آمدنی اتنی معقول نہ ہو جس سے میں اپنے اہل و عیال کا بوجھ آسانی سے اٹھا سکوں، تب تک شادی نہیں کروں گا۔

ابّا نے کہا اگر تم بوجھ سمجھ کر شادی سے انکار کرتے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ کیونکہ تم میری واحد اولاد ہو۔ بوجھ کے ذمّہ دار ہم ہوں گے نہ کہ تم۔ آخر یہ میری اتنی

دولت کس کام کی ہے"۔

میں نے کہا "درست ہے۔ مگر میں آپ کی ذمہ داری پر شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ کا ایسا ہی خیال تھا تو مجھے یونہی نکما اور نالائق رکھتے۔ تعلیم وغیرہ کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے مجھے اس قابل بنا کر اب خود ہی نالائق اور نکھٹو بننے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ مگر میری غیرت یہ کبھی گوارا نہیں کرے گی"۔

ابّا نے کہا "مجید! میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ میرا بیٹا اتنا روشن خیال ہے۔ مگر تمہاری امّی کو کیا کروں۔ اُسے تمہاری شادی کی بڑی آرزو ہے"۔

میں نے کہا "یہ ان کی کمزوری ہے۔ آپ انہیں سمجھا سکتے ہیں"۔

ابّا خاموش ہو گئے۔ مگر ان کے چہرے کی شگفتگی ان کی دلی مسرّت پر دلالت کر رہی تھی۔ بس اس دن سے پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہ ہوئی اور نہ ہی امّی نے کبھی کچھ جتایا۔ شاید وہ ابّا کے دباؤ سے خاموش تھیں۔

۶

میرے ابّا ریٹائرڈ ہو کر لاہور آ چکے تھے۔ میں ان دنوں شیخوپورہ میں محکمہ تعلیم کی ایک اعلیٰ ملازمت پر مامور تھا۔ چونکہ محکمہ تعلیم میں چھٹیاں زیادہ ہوتی ہیں اس لئے میں اتوار کے علاوہ بھی اکثر لاہور آتا جاتا رہتا تھا۔

دسمبر گزر رہا تھا۔ بوڑھاپے کا اور چند دن کا مہمان مایوس دسمبر آنے والے

سال کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا ہوا دنیا سے رخصت ہو رہا تھا اور نئے سال کے جشن کی تیاریاں بڑے دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ میں ہفتے کی شام کو گھر آیا تو کوٹھی کے سب کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے پائے۔ میں نے امّی سے اس اہتمام بلیغ کی وجہ دریافت کی تو امّی نے اپنے احساسات کو دباتے ہوئے مرتعش آواز میں کہا "ڈاکٹر طارق معہ اپنی فیملی کے پرسوں لاہور آرہے ہیں۔ اور ہمارے گھر ہی ٹھہریں گے۔"

رانی کھیت سے آخری مرتبہ آئے ہوئے مجھے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ اب ڈاکٹر طارق کا نام سن کر مجھے گزشتہ آٹھ سال کی سب بھولی بسری باتیں یاد آگئیں اور ایک مبہم سا خوف بھی محسوس ہوا۔ مگر اب میں جوان تھا کوئی جبر و تعدی ناممکن تھی۔ اس لئے میں نے ان خدشات کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن اتوار کی شام کو ایسا گھر سے نکلا کہ پھر کئی دن تک ادھر کا رُخ نہ کیا اور بڑے دنوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے بھی بمبئی جانے کا پروگرام بنالیا۔

بڑے دن کی چھٹیوں میں دو دن باقی تھے۔ میں کام سے واپس آیا تو گھر میں ابّا اور ڈاکٹر طارق موجود تھے۔ میں نے تعظیم وغیرہ کی۔ ابّا نے پچھلی اتوار ناغہ کرنے کی وجہ پوچھی۔ لیکن میں نے بہانہ پہلے ہی سوچ رکھا تھا، جس سے انہیں ٹال دیا۔ انھوں نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب تمہاری ملاقات کے لئے بہت بے قرار تھے۔ اسی لئے خود

تم سے ملنے آ گئے ہیں۔ کل ہم لوگ تاریخی مقامات کی سیر کریں گے اور پرسوں اکٹھے لاہور واپس چلیں گے"۔

باتوں باتوں میں مجھے یہ بھی پتہ لگا کہ ڈاکٹر طارق ایک ہفتہ ہمارے ہاں مہمان رہ کر کرائے کی کوٹھی میں اٹھ گئے ہیں جس کے آدھے پورشن میں وسطی رام دت رہتا ہے۔

یہ خبر سُنکر دل تو بہت خوش ہُوا مگر رسمی طور پر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! کرائے پر کوٹھی لینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ہم لوگ کوئی پرائے تھے"۔

ڈاکٹر نے کہا "نہیں بیٹا اگر چند دن کی بات ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ مگر میں تو سارا موسم سرما گزارنے کے لئے آیا ہوں۔ وہاں ہمیشہ سردیوں میں تمہاری خالہ کے پاؤں کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے امسال میں اس کو لاہور لے آیا تاکہ شاید اس تکلیف سے بچ سکے"۔

میں خاموش ہو گیا۔

تیسرے دن مجھے ان لوگوں کے ساتھ لاہور آنا پڑا کیونکہ ابا کی موجودگی میں انکار کی گنجائش نہ تھی۔ دوسرے دن مجھے رات کو بمبئی روانہ ہونا تھا لہذا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی امی نے خالہ جمیلہ سے جا کر ملنے کا حکم دیا۔ پہلے تو کچھ دیر میں نے لیت و لعل کیا۔ آخر کار مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ غرضیکہ میں ڈاکٹر طارق

کے گھر گیا۔ امّی بھی میرے ساتھ تھیں۔ خالہ جمیلہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس وقت ربابہ وہاں موجود نہ تھی۔ امّی نے قدرے توقف کے بعد ربابہ کی نسبت دریافت کیا۔ خالہ جمیلہ نے کہا۔

"ہم بھی ابھی راما دت اس کو اپنے گھر لے گئی ہے وہ لوگ اُس سے بہت محبت کرتے ہیں"۔

دسطی رام دت کی لڑکی راما دت بڑی آوارہ مزاج لڑکی تھی۔ گو میں نے آج تک اسے آنکھوں سے تو نہ دیکھا تھا مگر طالب علمی کے زمانے میں کالج کے لڑکوں سے اس کی آوارگیوں کے افسانے بہت سُنے تھے۔ کالج کے لڑکے اسے بٹر فلائی کہا کرتے تھے۔ اس لئے ربابہ اور راما دت کا میل جول مجھے کچھ اچھا نہ معلوم ہُوا مگر میں نے خالہ جمیلہ پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا کیونکہ جب مجھے ربابہ سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی تو اس کے معاملات میں مداخلت بھی بے معنی تھی۔

تھوڑی دیر تک ہم لوگ گھر واپس چلے آئے اور میں کھانا کھا کر اپنے ایک دوست کی ملاقات کو چلا گیا جو میرے ساتھ بمبئی جا رہا تھا۔ چار بجے کے قریب میں واپس آیا۔ ہماری کوٹھی چڑیا گھر کے پچھواڑے لارنس روڈ کے قریب واقع تھی جو ایک لمبی اور پرائیویٹ سڑک کے اختتام پر بنی ہوئی تھی۔

دسمبر کی کمزور اور بے اثر دھوپ سال کا لمبا دورہ ختم کرنے پر بے حال ہو کر درختوں کی مردہ آغوش سے نیچے گر رہی تھی۔ خستہ تن دھرتی اپنی زخم خوردہ

چھاتی پر سوکھے پتوں کے پھاہے رکھے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس لئے ذرا بھی بے ترتیبی سے قدم پڑتا تو اُس کے پوشیدہ زخم عریاں ہو جاتے اور وہ سسکیاں بھرنے لگتی۔ چنانچہ میں موسم کی ابتری پر بے دلی سے قدم اُٹھاتا۔ آہستہ آہستہ اُس لمبی سڑک پر چل رہا تھا جو چڑیا گھر کے ساتھ ساتھ سیدھی شملہ پہاڑی کی طرف چلی جاتی ہے۔

مجھ سے کچھ دور آگے ایک سیاہ سموری کوٹ والی لڑکی جا رہی تھی اور سامنے سے ایک چھٹی رساں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آ رہا تھا۔ اُس نے قریب پہنچکر لڑکی کو سلام کیا۔ لڑکی ٹھٹھکی اور وہ بھی ٹھہر گیا۔ اُن کی گفتگو تو مجھے سنائی نہ دی۔ البتہ چھٹی رساں کو ایک لفافہ لڑکی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے دیکھا۔ لڑکی آگے بڑھ گئی اور چھٹی رساں ساتھ والے موڑ پر گھوم گیا۔

آخر جب میں آگے چلا گیا تو میں نے ایک لفافہ زمین پر پڑا دیکھا۔ جو بدستور بند تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی لفافہ ہے جو ابھی ابھی چھٹی رساں نے سموری کوٹ والی لڑکی کے ہاتھ میں دیا تھا۔ یہ لفافہ مس راما دت کے نام تھا۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ یہیں پڑا رہے لیکن پھر اخلاقی فرض کے پیشِ نظر وہ لفافہ اٹھایا اور راما دت کے پیچھے بھاگا۔ راما دت شملہ پہاڑی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر لفافہ اُسے پیش کر دیا۔

"آہ! آپ کو یہ کہاں سے ملا؟" اُس نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے مدھم آواز

میں کہا۔

میں نے جواب دیا "جس مرٹرک پر سے ابھی ابھی آپ آ رہی ہیں"
اُس نے خفیف تبسم کے ساتھ لفافہ لے لیا اور شکریہ وغیرہ ادا کئے بغیر ہی بے پروائی سے آگے چلی گئی۔

سادات کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ لفظِ حُسن اُس کے سامنے بالکل بے حقیقت تھا۔ وہ دریائے حُسن کی ایک بے قرار لہر تھی۔ آسمانِ حُسن کی ایک تڑپتی ہوئی بجلی! اُس کا چہرہ صحیفۂ آسمانی کی طرح صاف اور بے داغ تھا جس پر صناعِ قدرت نے خد و خال کا نقشہ نہایت روشن اور نمایاں طور پر کھینچا تھا۔ اُس کی خط دار شفاف پیشانی کے کناروں پر نوکیلے خطوں میں سیاہ اور گھنے بال کچھ اس طریقے سے اُگے تھے جیسے کسی خوشنما قطعے کے حاشیے پر کالے کٹاؤ بنائے گئے ہوں۔ اُس کے خوشخط ابرو بالکل عربی نون کا نمونہ پیش کرتے تھے جن کے دونوں سرے ناک کی جانب جُھکے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں جو لمبی لمبی تیز پلکوں کے ہالہ میں گھری ہوئی دلوں پر بجلیاں گراتی تھیں۔ اُس کی ناک بالکل گول خوبانی کی طرح جس کے درمیان گہرا گڑھا تھا۔ اُس کے مرجانی لبوں کے سائے میں چمکیلے دانت دُرِ یتیم کی طرح آب و تاب دکھاتے تھے۔ اُس کا جسم پھولوں کی ڈالی کی طرح نرم و نازک اور لچکدار تھا۔

اِس مرمریں ناگن کو دیکھ کر مجھے اس بات کا افسوس ہونے لگا کہ میں نے

اب تک اُسے کیوں نہ دیکھا۔ وہ بے ترتیب انداز سے قدم اٹھاتی ہوئی جارہی تھی اور میرا دل اُس کے ہر قدم کی جنبش پر چل رہا تھا۔ غرض کہ وہ کالج کی بٹر فلائی، جو دوسرے لڑکوں کی نظروں میں ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی، ایک نگاہِ غلط انداز سے متاعِ دل چھین کر چلتی بنی اور میں اُداسی سے گھر لوٹ آیا اور اُسی شام کو بمبئی روانہ ہو گیا۔

دورانِ سفر میں اُس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی اس لئے مجھے بمبئی کی سیر میں کچھ لُطف نہ آیا اور وہ چھٹیاں میں بجھے ہوئے دل سے گزار کر گھر واپس آگیا۔ لیکن میں نے دل میں یہ پکّا فیصلہ کر لیا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کی کبھی کوشش نہ کروں گا کیونکہ وہ کسی شریف آدمی کے قابل نہ تھی۔ اسی خیال سے میں نے لاہور جانا بھی کم کر دیا۔

جنوری کا آخیر تھا۔ میں بہت دنوں کے بعد لاہور آیا تھا مگر میرا دل یہاں نہ لگا۔ میں وقت کاٹنے کے لئے لارنس باغ میں چلا گیا۔ خزاں اپنا پورا اسکہ جما چکی تھی۔ جگہ جگہ سوکھے پتّوں کے تودے لگے ہوئے تھے درخت بے برگ ہو کر بہار کا ماتم کر رہے تھے۔ شام قریب تھی۔ سردی کی وجہ سے سارا باغ سنسان اور ویران پڑا تھا۔ ہوا لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی مگر میں موسم کے سخت اور تند حربوں سے بے خبر اپنی حالت پر غور کر رہا تھا۔

اچانک شملہ پہاڑی کی طرف سے ایک لڑکی "جنٹلمین جنٹلمین" کہتی ہوئی میری

طرف بڑھی۔ میں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا تو میرے سامنے رامادت کھڑی ہانپ رہی تھی۔ اُس نے پچھلی ملاقات کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

جنٹلمین! میں سیر سے واپس آرہی تھی کہ راستے میں دو فضول سے لڑکے میرے ساتھ ہو لئے جو بہت بیہودہ باتیں کرتے رہے۔ اب مجھے خوف ہے۔ کہ وہ راستے میں پھر ستائیں گے۔ اس لئے ذرا تکلیف کر کے مجھے گھر تک پہنچا دیجئے۔ وہ کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔" غرضیکہ ایک ہی سانس میں اُس نے اپنا سارا مدعا بیان کر دیا۔

چودھویں رات کا چاند اس وقت سطح باغ پر نُور اُگل رہا تھا جس کی جوت اُس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر نُور کا ملمع چڑھا رہی تھی۔ اُس کی چمکیلی آنکھیں پوری کشادگیوں سے میرے چہرے پر گڑی ہوئی جواب کی منتظر تھیں۔ اس اتفاقیہ ملاپ سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں بغیر کچھ کہے سُنے اُس کے ساتھ ہو لیا اور تمام راستہ خاموشی سے طے کیا۔ آخر کار ہم لوگ کوٹھی کے قریب پہنچ گئے۔ جہاں وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سُنے تیزی سے کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہو گئی اور میں وہیں بُت بنا ہوا کھڑا رہ گیا۔

گو رامادت کا غیر مہذب برتاؤ مجھے بہت ناگوار گزرا لیکن محبت کو کیا کیا جائے۔ وہ تو کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس رات پھر مجھے نیند نہ آئی اور رہ رہ کر خیال آتا کہ اگر وہ آوارہ تھی تو اس نے غنڈوں سے محفوظ رہنے کے لئے مجھ سے

امداد کیوں طلب کی۔ اور بالفرض وہ اگر کبھی آوارہ تھی لیکن اب سدھر چکی ہے تو کیا ایک تائب عورت سے محبت ناجائز ہے۔ غرضیکہ دل کو تڑپا دینے والے جذبات کے ہجوم اور دماغ کو تھکا دینے والے خیالات کے طوفان نے تمام رات سونے نہ دیا۔

دوسرے دن میں ڈاکٹر طارق وغیرہ سے ملنے کے بہانے ان کی کوٹھی پر گیا ان کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو ڈاکٹر طارق جو ابھی ابھی کوٹھی سے نکلا تھا راستے میں مل گیا۔ وہ اس وقت کچھ برہم تھا۔ میں نے سلام کیا۔ وہ رک گیا اور ربابہ کی شکایت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

یہ لڑکی تو میرے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ ہر وقت چڑیا گھر میں گھسی رہتی ہے۔ حیوان کی بچی۔ درندوں کی عاشق۔ آج تو صبح سویرے گیٹ کھلنے سے پہلے ہی چلی گئی ہے۔ اور اب میں اسے واپس لانے کی غرض سے خود جا رہا ہوں۔

ڈاکٹر طارق ادھر گیا اور میں اسکی کوٹھی میں آ گیا۔ خالہ جمیلہ میرے خلاف معمول ادھر آنے سے بہت خوش ہوئی۔ میں کچھ دیر تو اس کے پاس بیٹھا اور پھر کوٹھی دیکھنے کے بہانے کمروں میں پھرتا پھراتا پچھلے برآمدے میں جا نکلا اور ادھر سے رامادت والے پورشن میں جا کر ان کے باغیچے میں پھرنے لگا۔ مگر خدا جانے وہ کہاں تھی۔ میں کافی دیر تک اس کے انتظار میں باغیچہ کا طواف کرتا رہا۔ لیکن وہ دکھائی نہ دی۔ آخر مایوس ہو کر گھر واپس چلا آیا۔

محبت کا روگ بھی بڑا خطرناک روگ ہے جو لاکھوں پرہیز اور لاکھوں احتیاطوں کے باوجود لگ جاتا ہے اور پھر بعض حالتوں میں اسے چھپانا بھی پڑتا ہے۔ اِن دنوں میرا بھی یہی حال تھا۔ نہ کسی کے سامنے اپنی پست خیالی اور ہیچ محبت کا اظہار کر سکتا تھا اور نہ اس سے ملنے کے کوئی دوسرے وسائل تھے۔ میں اس کی تلاش میں کئی بار ڈاکٹر طارق کی کوٹھی پر جاتا رہا مگر اُسے نہ دیکھ سکا۔

انہی اُلجھنوں میں بہت دن گزر گئے میں لاہور آیا ہُوا تھا۔ اور میرے ساتھ شیخوپورہ کے رہنے والے دوست بھی تھے۔ میں ان کو چڑیا گھر دکھانے کے لئے ساتھ لے گیا اور دیر تک ہم لوگ چڑیا گھر میں میر کرتے رہے مگر واپسی پر جب بند گھروں کی طرف گئے تو دُور سے مجھے راحت کا حسین چہرہ دکھائی دیا۔ وہ سنہری بارڈر والی ساڑھی پہنے آدمیوں کے ہجوم میں گھری ہوئی، ابی سینا کے بندر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں روشن ہو گئیں اور دل بے چین ہو گیا مگر میں نے ضبط کیا اور اُسے کنکھیوں سے دیکھتا ہُوا دوستوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

میرے دوست شام کو چلے گئے اور دوسرے دن مجھے بھی جانا تھا اس لئے صبح اُٹھ کر میں نے اپنا بہترین بلیو رنگ کا سوٹ پہنا اور بن سنور کر ڈاکٹر طارق کی کوٹھی پر گیا مگر وہاں تالے لگے ہوئے تھے۔ ملازم سے معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر طارق خالہ جمیلہ کو داتا گنج کے دربار لے کر گئے ہیں۔ میں پہلے تو برآمدہ میں ٹہلتا رہا۔ پھر ایک

بانس کے دروازے سے گزر کر لاما دت والے پویشن کے احاطے میں جا نکلا۔ مگر ان کے دروازے بھی بند تھے۔ میں ناامید ہو کر وہاں سے نکل آیا۔

راستے میں مجھے خیال آیا۔ شاید وہ سیر کرنے گئی ہو اور ممکن ہے مجھے راستے ہی میں مل جائے۔ میں اسی موہوم اُمید کے سہارے سڑک پر بغیر کسی ارادے کے چلتا گیا حتیٰ کہ چڑیا گھر کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر جی میں آئی کہ چڑیا گھر میں بھی اُسے تلاش کر لینا چاہئے کیونکہ پہلی دفعہ بھی جب میری اور اس کی ملاقات لفافے کی بنا پر ہوئی تھی، تو شاید وہ چڑیا گھر ہی سے آ رہی تھی اور آج سے ایک دن پہلے بھی میں نے اسے چڑیا گھر ہی میں دیکھا تھا۔

خیر میں چڑیا گھر میں داخل ہوا اور لاما دت کی جستجو میں ہر ایک لڑکی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔

فروری کا اختتام تھا۔ ہواؤں میں قدرے نرمی اور رنگینی پیدا ہو رہی تھی۔ بے جان اور بے اثر دھوپ کی حرارت پھر رفتہ رفتہ عود کرنے لگی تھی۔ درختوں کی ننگی اور خشک ڈالیوں میں نرماہٹ اور لچک پیدا ہو چلی تھی۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پرندوں کے کمھلائے ہوئے بھورے پروں کی رنگت بھی شوخی اور خوشنمائی اختیار کر چکی تھی۔

پرندہ گھروں کی طرف کئی ایک مور اپنے حسین، اور اطلسی پروں کی چھتریاں تانے والہانہ رقص کر رہے تھے۔ پنجرے کے دوسری طرف چند لڑکیاں اسی

جنّت سے خارج شدہ مخلوق کا اطلسی حسُن نہایت شوق سے دیکھ رہی تھیں جو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کے باوجود محض روایتی تقدس کے زعم میں ابھی تک اترا رہا تھا۔

مور اپنی اطلسی چھتری سمیت گھوما۔ لڑکیوں نے ایک نقرئی قہقہہ لگایا۔ قہقہہ کی آواز سنکر میری نظر فوراً پنجرے کے پار نکل گئی تو مور کے اجلے اور بھڑکیلے رنگ کی اطلسی چھتری کے پیچھے راما دت کا دلکش چہرہ اس طرح دکھائی دیا گویا کوئی حور کسی دوسری دنیا سے جھانکتے ہوئے جنّت کے اس معزول شدہ دربان کی جھوٹی اکڑفوں کا تمسخر اڑا رہی ہو۔

"یوسف جمال! یوسف جمال"!! میں نے بے خودی کے عالم میں کہا اور بے تابی سے اس کی طرف دوڑا۔

راما دت نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ بھی لڑکیوں کے نرغہ سے نکل کر میری طرف آئی۔ ایک نکّڑ پر ہم دونوں ملے۔

وہ بولی "آپ کسے تلاش کر رہے ہیں۔

میں نے کہا "تمہیں"۔

وہ کہنے لگی "نہیں آپ تو کسی یوسف جمال کو پکار رہے تھے"۔

میں نے کہا "ہاں تمہیں ہی پکار رہا تھا"۔

اس نے تعجب سے کہا "میرا نام یوسف جمال تو نہیں میرا نام تو.....!"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا ۔
"تمہارا نام چاہے کچھ بھی ہو مگر میں تمہیں یوسف جمال ہی کہوں گا۔"
اس نے تجسس سے پوچھا "کیوں"۔
میں نے اُسے ٹالتے ہوئے کہا "کیونکہ میرا ایک دوست جو بالکل تمہارا ہم شکل تھا، اس کا نام یوسف جمال تھا"۔
وہ بہت خوب کہکر خاموش ہو گئی۔
اس کے بعد ہم دونوں شیر گھروں کی طرف چلے گئے۔ اور کئی گھنٹے اکٹھے سیر کرتے رہے۔
میں نے اس کو آج اچھی طرح جانچا۔ اس میں شوخی چالاکی اور بناوٹ یا بے باکی نام کو بھی نہ تھی۔ وہ بالکل سادہ لوح اور کچھ کھوئی کھوئی سی لڑکی تھی۔ اس کی طبیعت سے واقف ہو کر میں اس کے بدنام کرنے والوں کو کاذب اور شیطان تصور کرنے لگا۔ چنانچہ جب میں اس سے جُدا ہُوا تو ہم دونوں آپس میں کافی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے۔
اسی طرح میں اُسے دو تین دفعہ چڑیا گھر ہی میں ملا۔ اس کے بعد یک دم وہ کہیں غائب ہو گئی۔ میں متفکر ہُوا۔ آخر ایک دن جبکہ وہ مجھے چڑیا گھر میں نہ ملی تو میں نے اس کے گھر جانے کی ٹھان لی اور واپسی پر سیدھا اس کی کوٹھی کا رخ کیا تو راستہ میں مجھے ایک پودبریہ نے سلام کیا۔ یہ راما دت کے باغیچہ کا مالی

تھا جو مجھے ایک دو مرتبہ ڈاکٹر کے ہاں دیکھ چکا تھا۔ میں نے جی کڑا کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ تمہاری مس صاحبہ آجکل کہاں ہیں۔

اُس نے جواب دیا "حضور ان کی تبدیلی پشاور ہو گئی ہے وہ آجکل وہیں ہیں"۔

کیا وہ ملازم ہیں؟ میں نے غیر متوقع انداز سے کہا۔

"جی صاحب وہ ہیڈ مسٹرس ہیں"۔ اُس نے کہا۔

"ہیڈ مسٹرس"؟ مجھے کچھ اچنبھا سا ہُوا۔ کیونکہ اس میں تو ہیڈ مسٹرس کی سی کوئی بات ہی نہ تھی۔ نہ تمکنت نہ وقار نہ بدماغی نہ خودسری۔ یہ انوکھی طرز کی ہیڈ مسٹرس تھی۔ غرضیکہ مالی تو آگے بڑھ گیا۔ اور میں یہی سوچتا گھر چلا آیا۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ ہوائیں بہار کا پیغام لا رہی تھیں۔ شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ سبزہ کی روئیدگی نمایاں ہو رہی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ کی روشنی اور چمک دوبالا ہو چکی تھی۔ میں اپنی کوٹھی میں داخل ہُوا۔ یہاں ہر طرف خاموشی تھی۔ میں سیدھا امّی کے کمرے میں چلا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میری آنکھوں نے ایک عجیب سین دیکھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ حُسن کی تیز ترین نورانی چمک دمک سے ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ کیونکہ امّی کے ساتھ پلنگ پر وہی یوسف جمال راما دت سوئی پڑی تھی۔

امّی بھی بام شباب حسین و جمیل تھی اور اس مقدس حُسن کی آغوش میں سویا ہُوا یوسفی حُسن ایک ہوش ربا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ گویا حُسن والا آغوشِ حسن کا فلسفہ

سامنے تھا۔ راما کا دلکش چہرہ بالکل دروازہ کے سامنے تھا۔ میری نظر پہلے اسی پر پڑی۔ میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

میری حالت اس وقت بعینہٖ وہی تھی جو کوہ طور پر جلوۂ ربی کو دیکھ کر موسیٰ کی ہوئی ہوگی۔ بالکل دم بخود! مجھے سخت تعجب تھا کہ راما کا امّی سے کیا واسطہ۔ وہ ان کے ساتھ اس بے تکلفی سے سو رہی تھی جیسے ماں بیٹی۔ پھر مالی نے تو ابھی بتایا تھا کہ راما پشاور میں ہے۔ غرضیکہ عجب گو مگو کا معاملہ تھا۔

اتنے میں امّی کی آواز آئی۔ انہوں نے ملازم کو پکارا۔ ملازم کے پیچھے میں بھی ہچکچاتا ہُوا اندر گیا۔ مجھے دیکھ کر امّی کہنے لگیں۔

"مجید تم کہاں جا کر بیٹھ جاتے ہو۔ میں بڑی دیر تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ آخر ربابہ آ گئی تو ہم دونوں لیٹ کر باتیں کرنے لگیں اور باتیں کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔ حالانکہ آج کل دوپہر کو سونا مضر ہوتا ہے"۔

ربابہ کا نام سنکر میں حیرت و استعجاب سے چیخ اٹھا۔

آہ! "یہ وہی قابلِ نفرت ربابہ ہے"۔ میں نے کہا۔

"نہ بیٹا ایسا نہ کہو۔ اب وہ سیانی ہو چکی ہے۔ اگر اس نے سُن لیا تو بُرا مانے گی"۔ امّی نے کہا۔

"نہیں امّی میں کوئی بُرے دل سے تو نہیں کہتا۔ یہ تو بدحواسی سے میں نے کہدیا ہے۔ کیونکہ میں آج تک اسے راما دت ہی سمجھتا رہا" میں نے جواب دیا۔

"نا مارٹ"؟ امّی نے اس طرح منہ بنایا گویا وہ منہ چڑا رہی ہوں۔ "وہ کیسے؟ اس کی اداؤں کی مناسبت ہی کیا ہے" امّی نے تنفر سے کہا۔

"ہاں میں تو ایسا ہی سمجھتا رہا" میں نے خجالت سے پھر بھی کہا۔

اس پہ امّی نے پوچھا "تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟"

میں نے آہستگی سے کہا "چڑیا گھر میں"۔

امّی بولیں "ہاں یہ چڑیا گھر کی بہت شوقین تھی اور ہر وقت چڑیا گھر میں ہی گھسی رہتی تھی اور باوجود ڈاکٹر کے منع کرنے بھی وہاں جانے سے باز نہ آتی تھی۔ آخر تنگ آ کر انہیں سختی سے کام لینا پڑا اور اب اس پہ پہرہ لگ چکا ہے تاکہ چڑیا گھر کی طرف نہ جانے پائے۔ لہٰذا اس وجہ سے یہ بیچاری میرے پاس آنا ہی غنیمت سمجھتی ہے"۔

حقیقتِ حال سے آگاہ ہو کر مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ جسے میں آسمانوں میں تلاش کرتا تھا وہ مجھے زمین ہی پہ مل گئی۔ وہ بھی گھر میں اور اپنے عزیزوں میں۔

وہ کس قدر حسین اور دلفریب دھوکا ہوا۔" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" امّی نے تعجب سے پوچھا۔

میں چپ ہو گیا اور اس خیال سے کہ امّی کوئی اور سوال نہ کر بیٹھیں، میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس دن رباب سے امّی نے میرا دوبارہ تعارف کرایا۔ اب ہمارے ملاپ

میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ میں جب چاہتا اسے سیر کے لئے ساتھ لے جایا کرتا۔

مارچ بیت گیا۔ اپریل چل رہا تھا۔ ہفتہ عشرہ تک ڈاکٹر صاحب بھی اپنی کھیت واپس جانے والے تھے۔ ان دنوں میں اور ربابہ اکٹھے سیر و تفریح میں مشغول رہتے۔ میری محبت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی مگر ربابہ کی طرف سے کبھی بھول کر بھی گرمجوشی کا اظہار نہ ہوا۔ اس لئے میرا کھلے لفظوں میں اظہارِ محبت ضروری تھا۔

ہفتے کی شام کو میں شیخوپورہ سے آیا۔ ربابہ ہمارے گھر ہی میں تھی۔ کھانے کے بعد میں نے اس سے سیر کے لئے کہا۔ اندھیری رات تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ امّی نے کہا۔

"یہ سیر کا کونسا موقع ہے"؟

"اس سے بہتر اور کونسا موقع ہوگا"؟ میں نے روکھے پن سے جواب دیا اور کچھ بے ڈھنگے انداز سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ چپ چاپ میرے ساتھ ہو لی اور امّی ٹک ٹک میرا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

آسمان میلا دھندلا اور تاریک تھا۔ گویا نظامِ فلکی میں بلیک آؤٹ ہو رہا تھا۔ ہوا کے تر و تازہ اور پُرنم جھونکے برسات کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ ہم دونوں اندھا دھند چلتے ہوئے شملہ پہاڑی پر جا پہنچے۔ گیندا اور گل شبّو کی پاکیزہ اور

معطر ہوائیں آپس میں مخلوط ہو کر نکہتوں کا طوفان برپا کر رہی تھیں۔ ہم سبزۂ خوابیدہ کو روندتے ہوئے ایک بنچ پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے۔ پہاڑی کی انتہائی بلندی پر سارا میدان جگنوؤں سے بھرا ہوا تھا جو اپنی کمزور روشنی سے اس چھوٹے سے میدان میں دیپ مالا کا سماں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ادھر رعد کا فرشتہ جو اپنے آبی رتھ پر سوار ہو کر آسمانی دیپ مالا کو گل کر چکا تھا، ان بے بضاعت اور کم مایہ کیڑوں کی جسارت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتا، تو اُس کے دانتوں کی چمک سے یہ حقیر روشنی ماند پڑ جاتی بلکہ بالکل بجھ سی جاتی۔

میں گفتگو کا کوئی موضوع سوچ رہا تھا کہ بجلی زور سے چمکی۔ رُبابہ بولی۔

بارش ہونے لگے تو پھر!

میں نے کہا تو پھر کیا یہ کوئی عام بارش تھوڑی ہے۔ ابرنیساں ہے"۔

اس نے حیرانی سے کہا۔ "ہائیں ابرنیساں کیا بلا ہوتی ہے میں نے تو آج تک اس کا نام بھی نہیں سُنا۔"

مجھے اچھا خاصہ موضوع مل گیا۔ میں نے کہا۔

"ابرنیساں اُس برسات کو کہتے ہیں۔ جو نوروز کے بعد ان ایّام میں پہلی بارش ہوتی ہے۔ جبکہ آفتاب برجِ حمل میں ہوتا ہے"۔

برجِ حمل کے بھی معنی بتاؤ۔ میں ان باتوں کو کیا جانوں" اس نے کہا۔

میں نے اسے بتایا "آسمان بارہ حصّوں میں تقسیم ہے۔ ان بارہ حصوں کو بارہ

برُج کہتے ہیں اور آفتاب سال تک ان سب برجوں کا دورہ ختم کر کے نوروز کے دن پھر پہلے برج یعنی حمل میں داخل ہوتا ہے اور ان ایام میں جو بارش پہلے ہوتی ہے اس کو ابر نیساں کہتے ہیں"۔

ربابہ کہنے لگی۔ "اونہہ کچھ بھی نام رکھو۔ آخر ہے تو یہ بھی برسات ہی نا"۔

میں نے کہا "ہاں ہے تو یہ بھی برسات مگر اسے دوسری برساتوں سے بہت کچھ شرف حاصل ہے۔ اسی سے درخت پھل لاتے ہیں۔ اناج میں رس آتا ہے۔ اسی کے قطروں سے سیپیوں کے اندر گوہر بے بہا بنتا ہے۔ اسی کی گرج سے کانوں میں ہیرا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کی چمک سے سونے کے اجزا کی تکمیل ہوتی ہے۔ غرضیکہ ہر ایک چیز کی زندگی کا دارو مدار فقط ابر نیساں پر ہے۔ تو پھر عاشق و معشوق کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے"۔

ربابہ قدرے تیکھے پن سے بولی۔ "مگر عاشق و معشوق کون؟"

میں نے بشاش لہجے میں کہا "جیسے ہم دونوں"۔

"یعنی بھائی اور بہن" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں" میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔

"تو پھر کون" اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔

"فقط لڑکی اور ایک لڑکا" میں نے جواب دیا۔

مگر ہم دونوں بہن بھائی ہیں۔ آپ نے عاشق و معشوق کیسے کہدیا" چمک کے

کہنے لگی۔

پھر میں نے بات ٹال دی اور خاموش ہو گیا۔

پھر ایک عارضی سکوت کے بعد میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے محبت بھری آواز سے کہا۔

"ربابہ میری اچھی ربابہ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے"

اس کے جواب میں اس نے بھی ویسے ہی میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ بھیّا میرے اچھے بھیّا۔ مجھے بھی آپ سے بے انتہا محبت ہے"۔

میں نے کہا۔ "تو پھر ہم دونوں شادی کیوں نہ کرلیں"۔ شادی کے نام پر وہ چونک سی پڑی۔

"ہائیں کبھی بہن بھائی میں بھی شادی ہو سکتی ہے"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

"مگر ہماری تو ہو سکتی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"کبھی نہیں" اس نے زوردار لفظوں میں کہا۔ "ہماری دینیات کی استانی کہا کرتی تھی کہ بہن بھائی کی شادی کسی مذہب میں بھی جائز نہیں ہے"۔

میں نے کہا۔ لیکن یہ پابندی تو سگے بھائی بہن پہ عائد ہوتی ہے چچا زاد یا خالہ زاد پہ نہیں بلکہ ایسی شادیاں آئے دن ہوتی رہتی ہیں"۔

وہ کچھ لاجواب سی ہو کر سوچنے لگی۔ پھر بولی "بھیّا ایسی بات دوبارہ نہ کرنا"

میں نے کہا "کیوں"

وہ کہنے لگی "ہماری اُستانی کہا کرتی تھی کہ مرد اپنی بیوی کا مالک ہوتا ہے۔ اس واسطے مرد کا ہر حکم ماننا عورت پر فرض ہوتا ہے تو آگے اَبّا ہی اپنے حکم منوانے کے لئے کیا کم ہیں کہ اب شادی کی جھنجھٹوں میں پڑوں۔"

اس پر میں نے اسکی یہ بدگمانی دُور کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر اس نے میری باتوں پر کان نہ رکھا اور ہنس ہنس کر ٹالتی رہی۔ اتنے میں بوندا باندی ہونے لگی اور ہم لوگ گھر واپس آ گئے۔

ربابہ کی اس رات والی گفتگو سے میرا دل بہت آزردہ ہُوا۔ میں صبح اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا اسی اُدھیڑبن میں مصروف تھا کہ امّی تشریف لائیں اور میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

مجید رات کو تم نے بہت نازیبا حرکت کی۔ اتنی اندھیری رات میں عین بارش کے موقعہ پر، ربابہ کو ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا۔ آخر وہ بھی کسی ایسے ویسے کی لڑکی تو ہے نہیں۔ میں تو دعائیں مانگتی رہی کہ تمہارے ابّا کو پتہ نہ لگے۔"

میں نے ندامت سے کہا "اچھا معاف کیجئے مجھ سے غلطی ہوئی۔ اب آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔"

اس پر امّی نے جھلا کر کہا۔ "مگر تمہیں اُس سے شادی کرنے میں کیوں عذر ہے"

میں نے کہا "شادی تو تب ہی ہو سکتی ہے جب اسے بھی منظور ہو۔"

امّی نے کہا "تم نے اس سے کبھی پوچھا تھا۔"

"میں نے کہا" ہاں کل رات اسی لئے اس کو سیر کے واسطے لے گیا تھا"۔
امّی نے کہا "تو اُس نے کیا کہا"۔
"یونہی فضول باتیں۔ یعنی نہ اقرار نہ انکار" میں نے جواب دیا۔
امّی نے کہا "تمہیں کچھ کہنا مناسب نہ تھا ہم خود ڈاکٹر سے کہہ سکتے تھے"۔
میں نے کہا "نہیں اس سے بھی پوچھنا ضروری تھا کیونکہ اب زمانہ اور ہے"۔
امّی کہنے لگیں "لاکھ زمانہ اور ہو مگر پھر بھی لڑکی اپنے والدین کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتی اور پھر ربابہ جیسی لڑکی۔ گٹھو کی گٹھو۔ وہ ان باتوں کو کیا جانے۔ اگر اُسے تم سے کچھ لگاؤ ہو بھی تو وہ اس کے اظہار سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ کوئی آجکل کی طرح چاتر تھوڑی ہے"۔

واقعی امّی نے لاکھ روپے کی بات کہی۔ میں ان کی دانائی اور فہم و فراست کا قائل تو پہلے ہی تھا مگر اب تو بالکل معتقد ہی ہو گیا۔ اور شادی کے واسطے میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

۷

اس دن سے پھر میں نے کبھی ربابہ کو نہ دیکھا اور نہ ہی ہمارے گھر میں پھر اس کے متعلق کوئی ذکر ہوا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر طارق کی فیملی رانی کھیت واپس چلی گئی مگر پھر کبھی امّی نے شادی بیاہ کا نام بھی نہ لیا۔ البتہ امّی کا غمگین چہرہ کسی بدشگونی کا

اعلان کرتا تھا تاہم مجھے ان سے سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار چچا نقی کی زبانی معلوم ہوا کہ ابا نے ڈاکٹر سے ربابہ کا رشتہ طلب کیا تھا مگر ڈاکٹر نے بڑی ترشروئی سے انکار کر دیا۔ یہ سُن کر میں بہت آزردہ ہوا۔ مگر کسی پر زور تو تھا نہیں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش! سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔

سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ ابھی یہ صدمہ تازہ ہی تھا کہ ابا جان کا انتقال ہو گیا۔ مجھ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا۔ امی کی شکستہ دلی اداسی اور درماندگی بھی حد سے بڑھ گئی۔ اس لئے اب میرا گھر پر رہنا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ میں نے کوشش کر کے اپنی تبدیلی لاہور میں کرا لی۔

رفتہ رفتہ اس واقعہ کو تین سال گزر گئے۔ میرا دل بھی کچھ مضبوط ہو گیا تھا اور امی بھی صبر و شکر کی عادی ہو چکی تھیں۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مچھروں نے خلقِ خدا کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ لاہور کے مچھروں کی داستانِ ظلم کچھ باہر کو ٹھیوں میں بسنے والوں کے دل ہی جانتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے شہروں کے مچھر تو صرف شبخون مارنا ہی جانتے ہیں لیکن لاہور کا جانباز مچھر تو دن ڈوبنے کا انتظار ہی نہیں کرتا۔ ادھر دوپہر ڈھلی اور ادھر ان کے لشکر زہریلی برچھیاں لئے مردانہ وار میدان میں آ دھمکے۔ یوں تو یہ لشکر لاہور فتح کرنے کی خاطر ہمیشہ جنگ جاری رکھتے ہیں مگر امسال تو شاید انہوں نے اپنی فوج دوگنی تگنی کر رکھی تھی جو دن دہاڑے ہی گوریلا وار شروع کر دیتے۔ مچھر دانیاں، فلٹ اور مسکیٹو آئل وغیرہ کام نہ دے سکے۔

اور یہ مورچے بیکار ہوتے ہی ملیریا کے بیماروں سے ہسپتال بھرنے لگے۔
چنانچہ امّی بھی ملیریا کی زد میں آگئیں اور قریباً دو ماہ تک اس موذی مرض میں مبتلا رہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں زیادہ کمزور دیکھ کر پہاڑ پر جانے کا مشورہ دیا۔ اب ہم لوگ اس غور و فکر میں تھے کہ کون سے پہاڑ پر جائیں۔ میں اور امّی تو اب رانی کھیت سے بہت بیزار تھے کیونکہ ہم لوگ پھر ڈاکٹر کا منحوس چہرہ نہ دیکھنا چاہتے تھے مگر چچا نقی رانی کھیت جانے پر ہی مصر تھا۔ آخر اسی کی جیت ہوئی۔
رانی کھیت جا کر ہم نے ایک ایسی جگہ پر کوٹھی لی جو ڈاکٹر طارق کی کوٹھی سے دو میل دور ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھی۔ وہی رانی کھیت تھا۔ وہی اس کی جمالیاتی شان اور وہی مسکراتے ہوئے مناظر۔ اس کے باوجود ہمارا سبزن پھیکا اور سونا ہی گزرتا رہا اور باڈلی کی طرف جانے کی تو گویا میں نے قسم ہی کھا رکھی تھی۔ مگر چچا نقی اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ آخر ایک دن وہ بڑے اصرار سے مجھے بھی ساتھ لے گیا۔ یہاں کی فضا بدستور سرمست اور رنگین تر تھی۔ ہم دونوں پھر اسی پتھریلی چٹان پر جا بیٹھے۔ میں ماضی کی یاد میں کڑھنے لگا۔ اور چچا نقی نے ڈاکٹر کو کوسنا شروع کیا۔ عین اسی وقت تیتریوں کا حسین غبار پھر بلند ہوا۔ اور ساتھ ہی رنگین کبوتر بھی خوفزدہ ہو کر اڑنے لگے۔ پھر پھولوں کا فرش بھی زیر و زبر ہونے لگا۔ ہماری مشتاق نگاہیں بھی کسی نقاب کشائی کے انتظار میں ادھر جم گئیں۔

دفعتاً پھولوں کے غلاف میں شگاف کرتا ہُوا ایک کتّا نمودار ہُوا۔ چچا نقی افسوس سے کہنے لگا۔

"وائے قسمت فرشتے کی بجائے کتّا نکلا"۔ مگر پھر دوبارہ فوراً ہی بولے۔

"نہیں مجید یہ کتا بھی تو شاید ڈاکٹر طارق کا جیک ہی معلوم ہوتا ہے"۔

کتّے کی قوتِ حافظہ بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے کئی سال کے بعد بھی ہمیں پہچان لیا۔ وہ تیر کی طرح سیدھا ہمارے پاس پہنچا اور دم ہلا ہلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر طارق کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی وہ اپنے کتّے کی تلاش میں پگڈنڈی کے ذریعہ پہاڑ سے اتر رہا تھا۔ وہ اسے سیٹیاں دیکر بلاتا رہا مگر کتّا نہایت باغیانہ انداز سے حکم عدولی کرتا رہا۔ آخر وہ جھلاتا ہُوا ہماری طرف بڑھا۔ مجبوراً ہمیں سلام کہنا پڑا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بہت حیران ہُوا۔

"اوہ مجید اور چچا نقی"۔ اُس نے چلا کر کہا۔ اور کتّے کا خیال چھوڑ چھاڑ کر ہماری طرف بڑھا اور اس محبت سے بغلگیر ہُوا گویا ہماری آپس میں کوئی رنجش ہی نہ تھی۔

"تم لوگ آئے کب ہو"۔ اس نے دریافت کیا۔

میں نے کہا "دو ماہ ہوئے"۔

"ہائیں! دو ماہ؟" اس نے رنجیدگی سے کہا۔ "اور مجھے اطلاع تک نہ دی۔ اتنی

بیگانگی آخر کس وجہ سے"۔

میں چپ رہا۔ اس نے پھر پوچھا۔

"اچھا کہاں ٹھہرے ہو"۔

میں نے کوٹھی کا پتہ دیا۔ وہ کہنے لگا "اچھا کون کون آیا ہے"۔

میں نے کہا۔ "میں، چچا نقی اور امی"؟

"بس؟ تو کیا بھائی امداد حسین نہیں آئے"۔ اُس نے کہا۔

اس پر میں نے ان کی وفات کا حال سنایا۔ ابا کی موت کا حال سنکر ڈاکٹر طارق کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ دلی رنج سے روتا رہا۔ اور پھر اسی وقت ہمارے ساتھ امی کی ملاقات کے لئے ہماری کوٹھی پر آگیا اور امی سے تعزیت کے بعد علیحدہ رہنے اور ابا کی موت کی اطلاع نہ دینے کا شکوہ کرنے لگا۔ لیکن امی نے صاف کہدیا کہ۔

"ہمارے اور آپ کے تعلقات اسی وقت ٹوٹ گئے تھے جب آپ نے ہمیں رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ان ظاہرداریوں کا کیا فائدہ"؟

امی کی بات سنکر وہ بہت تلملایا اور گلوگرفتہ آواز میں کہنے لگا۔

"بھابی آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ خدا گواہ ہے میں نے اس رشتے کو ٹھکرایا نہ تھا۔ بلکہ مجید کو خرابیوں سے بچانے کے خیال سے میں نے انکار کیا تھا۔ ریاب کسی صورت بھی مجید کے قابل نہ تھی۔ لہذا میں ایسی شادی کی جو بالکل بے جوڑ ہو، اور

سراسر خجالت تھی۔ کس طرح حامی بھر لیتا۔"

امّی نے کہا "آپ کا یہ خیال محض عذرِ لنگ تھا۔ کیونکہ وہ بُری یا بھلی غرضیکہ جو کچھ بھی تھی۔ ہمیں منظور تھی۔"

اُس نے کہا "تو مجید بے چارے کا کیا حشر ہوتا۔ اس کا بھی تو کچھ خیال کرنا ہی تھا۔"

امّی نے زور دار لفظوں میں کہا۔ "ہاں اسے رباب سے محبت تھی۔ آپ نے اس کا دل توڑ دیا۔"

"محبت اور رباب سے محبت"؟ ڈاکٹر نے پھٹی پھٹی اور سُوکھی سُوکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوہرایا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

"ہاں محبت"۔ امّی نے جواباً کہا۔

ڈاکٹر کا سر نیچا ہو گیا وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی اِس غلطی پر امّی سے معافی مانگی اور ہمیں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرنے لگا۔ ہم لوگ اس وقت تو نہ گئے مگر اس نے دوسرے دن آنے کا وعدہ لے لیا۔

دوسرے دن شام کے قریب ہم لوگ ڈاکٹر کی کوٹھی پر گئے۔ رباب سُرخ اطلس کے لباس میں ملبوس اس طرح ہمارے استقبال کو بڑھی جیسے شفق کا چلتا پھرتا سایہ یا پُروا کی ہوا میں تیرتا ہوا کسُم کا پھول۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر چند ایک مہمانوں کو بھی اندر لے آیا جن میں ایک آدمی جبّہ و دستار سے سرفراز تھا۔ اس نے آتے ہی طرفین میں ایجاب و قبول کی بات چیت شروع کر دی۔ گویا میرا نکاح ربابہ سے ہونے لگا۔ امّی نے اس بات سے آگاہ ہو کر بہترا شور مچایا کہ میرا اکلوتا بچہ ہے۔ میں ایسے چوروں کی طرح اس کی شادی نہیں کر سکتی۔ مگر ڈاکٹر نے ایک نہ سُنی اور چچا نقی بھی ڈاکٹر سے متفق ہو گیا تھا۔ غرضیکہ امّی کی اجازت اور ربابہ سے ایجاب و قبول کے بغیر میں نے اور ڈاکٹر طارق نے آپس میں ایجاب و قبول کر کے چار کلمے پڑھ لئے اور اسی رات کو ربابہ میرے گھر بھیج دی گئی۔

امّی نے ڈاکٹر کی اس حرکت کو انتہائی ظلم اور سنگدلی پر محمول کیا۔ گویا وہ ربابہ کی اس قدر بے قدری کر کے اُسے ہماری نظروں سے گرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب ہم لوگ لاہور واپس آنے لگے تو اس نے ہم سے کُھلے لفظوں میں کہا۔ کہ اس لڑکی کو اب اپنے پاؤں کی جوتی بنا کے رکھنا ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔

ڈاکٹر کی اس جبر و تعدی پر ہمیں اس سے نفرت سی ہو گئی۔ وہ ربابہ کو ہماری نظروں سے گراتے گراتے خود بھی ہماری نظروں سے گر گیا۔ ہم لوگ ربابہ کی زیادہ عزّت اور قدر کرنے لگے۔ پہلے پہلے تو ربابہ مجھے خاوند سمجھ کر خوفزدہ سی رہتی مگر آہستہ آہستہ وہ مجھ سے مانوس ہو گئی اور یہ بے جا ڈر اس کے دل سے دور ہو گیا۔

انہی چاؤ چونچلوں میں ایک سال گزر گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ربابہ بہت حد تک خودسر اور منہ زور ثابت ہو رہی ہے۔ میری دلجوئیوں امی کی ناز برداریوں اور چچا نقی کے لاڈ پیار نے اس پر اُلٹا اثر کیا۔ جس ضد پر تُل جاتی منوا کر ہی چھوڑتی۔ حتیٰ کہ چار سال تک وہ اتنی سرکش اور نڈر ہو گئی کہ مجھے بات بات پر جھڑک دیتی۔ چچا نقی کا تو بالکل ادب و لحاظ نہ کرتی بلکہ بعض اوقات امی سے بھی درشتی سے پیش آتی۔ میں اس کی حالت دیکھ کر اکثر اس سے شادی کرنے پر پچھتانے لگتا۔ گو مجھے اب بھی اس سے بدستور محبت تھی مگر یہ مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔ میں جب امی سے اس کی شکایت کرتا تو امی الٹا مجھے ہی جھوٹا کرنے لگتی۔

چونکہ میں امی کا اکلوتا بیٹا تھا اس لئے امی کو پوتے کی بہت آرزو تھی۔ اور اس عرصہ میں اس کو دوبارہ امیدواری بھی ہوئی مگر ہر دفعہ تیسرے چوتھے مہینے اسقاط ہوتا رہا اور وہ اس آئے دن کی تکلیف سے کچھ کمزور بھی ہو چکی تھی۔ امی اس لئے اس کے آگے سے بھی زیادہ خوشامد درآمد کرنے لگی کہ شاید زیادہ خوش وخرم رہنے سے وہ کوئی جیتا جاگتا بچہ پیدا کر سکے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

امی اسی خبط میں مبتلا رہنے لگیں۔ ربابہ کا آئے دن علاج ہوتا رہا کبھی لیڈی ڈاکٹروں کا، کبھی دائیوں کا، کبھی ٹونے ٹوٹکے۔

میں ان دنوں لائل پور میں تھا۔ میری کوٹھی شہر سے دور اور نہر کے قریب میلوں لمبے چوڑے میدانوں اور پُر سکون و شاداب کھیتوں کی گود میں واقع تھی۔ نہر سے پار ایک سرکنڈے کا جنگل تھا جس کے پرے خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ امّی کو نہ جانے کس نے پتہ دیا کہ ان جھونپڑیوں میں قلندر قوم کی ایک عورت بڑی سیانی ہے۔ یہ دائی پن بھی کرتی ہے اور عورتوں کے اندرونی نقائص دور کرنے کی بڑی بڑی مجرب دوائیں جانتی ہے۔

امّی نے جو اسی بات پر اُدھار کھائے بیٹھی تھیں، جھٹ اس عورت کو طلب کیا۔ اس عورت کا نام حسنی تھا۔ یہ ایک معقول عورت تھی۔ اس نے امّی کو بتایا کہ ربابہ کو اٹھراہ کا مرض ہے۔ جس کے دفعیہ کے لئے ایک خاص قسم کا موتی ٹخنے پر باندھا جاتا ہے۔ اس موتی کو اٹھراہ کا منکہ کہتے ہیں۔ منکہ بازار میں بھی بکتا ہے مگر وہ نقلی ہوتا ہے۔ مگر اصلی منکہ حسنی کے پاس موجود تھا اور یہ حمل کی حفاظت کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا تھا۔ امّی خوش تھیں کہ اب اگر ربابہ پھر حاملہ ہوگی تو اٹھراہ کے منکے کے ذریعے وہ گوہر مقصود حاصل کر سکیں گی۔

میں اور ربابہ دونوں منہ اندھیرے ہی سیر کو جایا کرتے تھے۔ لہٰذا حسب دستور ایک دن ہم لوگ سیر سے واپس آ رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ساون کے بادل اطراف و جوانب سے کالی کالی بلاؤں کی طرح نازل ہو رہے تھے۔ پروا کی ہوائیں پوری طاقت سے چل رہی تھیں۔ جب ہم نہر کے کنارے سرکنڈے کے جنگل کے قریب

پہنچے تو بارش شروع ہوگئی۔ ہماری کوٹھی ابھی دور تھی۔ رتابہ نے کہا۔

"یہاں قریب ہی ایک جائے پناہ ہے۔ وہاں جا کر بارش سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

وہ مجھے سرکنڈے کے جنگل سے پار ایک جھونپڑی میں لے گئی۔ یہ جھونپڑی صاف ستھری اور بڑی کاریگری سے کچی مٹی کے ساتھ لیپی گئی تھی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اندر جانے لگی۔ میں نے اُسے روکا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ حسنی کی جھونپڑی ہے۔ ہماری آواز سنکر ایک گٹھیلا جوان اندر سے نکل آیا۔ یہ گندمی رنگ اور تیکھے نقوش والا جوان کھدر کے معمولی لباس میں تھا جس کے کانوں میں چاندی کے مندرے پڑے تھے۔ اس کے پیچھے ایک سانولے رنگ کی مگر خاصی منہ لگتی ناک نقشہ سے درست، جوان لڑکی بھی تھی۔

لڑکی تو ہمیں دیکھتے ہی اُلٹے پاؤں لوٹ گئی لیکن جوان نے بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔ اسی وقت وہ جوان لڑکی جو شاید حسنی کو بلانے کے لئے اندر چلی گئی تھی اسے ساتھ لئے پھر باہر آگئی۔ حسنی مجھے دیکھتے ہی دعائیں دیتی ہوئی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی اور اس جوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

حضور یہ میرا بیٹا سجاول ہے۔ اور یہ میری بہو روشنی ہے۔

میری نظریں سجاول کی چوڑی چھاتی، توانا جسم اور مضبوط رگ پٹھوں پر جم،

ہوئی تھیں جو روٹی کے سوکھے ٹکڑے کھا کر ایسی صحت و تندرستی کا مالک تھا کہ محلوں میں بسنے والے سونے چاندی کے مرکبات کھا کر بھی حاصل نہ کر سکے۔ مجھے اس کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی۔ ہم لوگ جھونپڑی سے نکلے۔ مگر بجائے گھر جانے کے ربابہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھونپڑی کے پچھواڑے لے گئی۔ ہم دونوں آگے آگے جا رہے تھے اور دلشاد کہ ہماری اردلی میں تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا چاروں طرف سے کھلا ہوا چھپر تھا اس کے نیچے پتھر کی ایک بہت بڑی چکی نصب تھی جس پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے دو ریچھ چکی کو گھر گھر چلا رہے تھے اور ان کے قریب ہی ایک سات آٹھ سال کا لڑکا بیٹھا تھا جو وقتاً فوقتاً ہاتھ سے چکی میں دانے ڈالتا جاتا تھا۔

ان کھلے ہوئے ریچھوں کو دیکھ کر میں ہچکچایا مگر ربابہ آگے بڑھ کر کہنے لگی۔
"آئیے یہ کچھ نہیں کہتے۔" پھر بڑے ریچھ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ "اس کا نام دھنا ہے اور وہ دوسری اس کی مادہ ہے۔ اس کا نام سوانی ہے۔ اور اس لڑکے کا نام حسن ہے یہ دھنی کا یتیم بھتیجا ہے اور انہی کے پاس رہتا ہے۔"

ادھر سے ہٹ کر وہ دوسرے حصے کی طرف گئی۔ یہاں ایک دو گز اونچی مچان پر ایک بندر بیٹھا بان کی رسی بٹ رہا تھا اور مچان کے نیچے لکڑی کے کھلونوں کا

ایک پنجرا سا تھا جس کے دروازے پر ایک بندریا اپنے دو بچوں کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور ان کی جوئیں نکال رہی تھی۔

بندر ہمیں دیکھ کر گھرکیاں دینے لگے مگر سجاول نے انہیں ڈانٹ دیا۔ تاہم ربابہ ان کے قریب نہ جا سکی اور دور سے ہی مجھے بتانے لگی۔

"اس بان بٹنے والے کا نام گگّہ ہے اور اس کی بیوی کو میراں کہتے ہیں اور وہ اس کے دو جڑواں بچے ہیں ایک کا نام روڈا ہے اور دوسرے کا جھنڈا۔ یہ دونوں بہت شریر ہیں"۔

پھر ایک کونے میں گئی جہاں ایک بکرا کھونٹی سے بندھا ہُوا تھا۔

"اس بکرے کا نام جیون ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور جھٹ بندر کی طرح اس پر سوار ہو گئی۔ پھر وہاں سے اتر کر نہ جانے کہاں سے ایک ڈگڈگی نکال لائی اور اسے بجانے لگی۔ وہ بہت خوش تھی۔

مشرق کی طرف سے آسمان صاف ہو چکا تھا اور ہلکی پیلی دھوپ سے اُس کا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ اُس کی اس بے تکلفی اور بے باکی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اکثر ان قلندروں کے پاس آتی جاتی ہے۔ مجھے اُس کی یہ حرکتیں بہت ہی ناگوار گزریں مگر میں خاموش رہا۔

اس کے بعد ہم لوگ واپس آئے۔ وہ راستہ بھر ان ہی جانوروں کے متعلق باتیں کرتی رہی کہ دھنا چار سال کا بچہ ہے۔ یہ سجاول نے دو دن کا بچہ

لے کر پالا تھا اور اُس کی مادہ اُس نے اسّی روپے میں خریدی ہے۔ اور اب سُوانی حاملہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ اُسے تو میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن گھر پہنچ کر اُمّی سے میں نے شکایت کی کہ انہوں نے ربابہ کو ایسا کھُلا چھوڑ رکھا ہے کہ وہ قلندروں کے گھروں میں جاکر اُن سے اس طرح گھی کھچڑی ہو جائے اور ڈگڈیاں بجاتی پھرے۔ مگر امّی نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور کہنے لگیں۔

"ربابہ سوائے ایک دفعہ کے کبھی اُن کی جھونپڑی پر نہیں گئی۔ اس بار بھی ہم لوگ یونہی بارش سے بچنے کے لئے اُدھر جا نکلے تھے۔ چچا نقی بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اگر ربابہ نے تمہارے سامنے کوئی فضول حرکت کی ہو تو یہ اُس کا بچپنا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ دن بھر آوارہ پھرتی رہتی ہے۔"

میں لاجواب ہو گیا۔

اس بات کو ابھی دو ہی مہینے گذرے تھے۔ کہ ربابہ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اُس کو اپنے ساتھ قلندروں کے گھر لے جاؤں کیونکہ سُوانی کے بچہ پیدا ہُوا ہے اور امّی وہاں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے انکار کر دیا جس پر وہ کئی دن تک مجھ سے رُوٹھی رہی اور بسورتی رہی مگر میں نے پروا نہ کی۔ آخر ایک دن میں دفتر سے واپس آیا تو ربابہ پلنگ پر پڑی تھی۔ امّی اور چچا نقی اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ معلوم ہُوا کہ آج ربابہ چوری چھپے قلندروں

کے گھر چلی گئی تھی۔ اتفاقاً وہاں بھی اس وقت حسّے کے سوا دوسرا کوئی موجود نہ تھا۔ ریچھ کا بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا اس نے دودھ پیتے بچّے کو اُٹھانا چاہا۔ جس پر سوانی بگڑ گئی اور اُس نے پنجہ مار کر اس کا ہاتھ بری طرح زخمی کر دیا۔

مجھے اس کے زخمی ہونے سے تشویش تو بہت ہوئی لیکن ایک حد تک اطمینان بھی ہو گیا کہ اب اُسے خوب نصیحت ہو گئی ہو گی۔ اس زخم کی وجہ سے وہ تقریباً دو مہینے تک زیرِ علاج رہی لیکن شامت اعمال اس کی علالت کے دوران ہی میں سُوانی مر گئی۔ سُنا گیا کہ اُسے زہرباد ہُوا تھا اور وہ دو دن بیمار رہ کر مر گئی۔ قلندر بہت غمگین ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک تو اُن کے اسّی روپے ضائع ہو گئے تھے دوسرے اُن کو دھنے کا اندیشہ تھا۔ جانوروں میں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی مادہ کی موت کے صدمے سے نر بھی گھل گھل کر مر جاتا ہے۔ مگر ربابہ اُس کی موت پہ بے حد خوش ہوئی۔ اُس نے حسّنی کے مُنہ پر کہدیا۔

"سوانی میری بد دُعا سے مر گئی ہے۔ جس بچّے کو وہ مجھے چھُونے بھی نہ دیتی تھی۔ اب کیسے لاوارث چھوڑ گئی۔"

کچھ دن بعد وہ بچہ ریچھ حسّے کی معیّت میں ہماری کوٹھی پہ بھی آنے لگا۔ اس کا نام قلندروں نے تھنگا رکھا تھا۔ یہ دو مہینے کا ننھّا منّا ریچھ بہت اچھا

لگتا تھا لیکن جب رفتہ رفتہ ہمارے گھر میں مستقل طور پر رہنے لگا تو میں نے اسے رکھنے کی مخالفت کی۔

امّی نے کہا "چلو مشغلہ ہی سہی۔ ربابہ بہلی رہے گی۔"

میں نے کہا "آخر درندہ ہے۔ بڑا ہو کر وہ کس کے قابو میں رہ سکے گا۔"

امّی نے کہا "اچھا بڑا ہو گا تو دیکھا جائے گا۔"

خیر جھنگا ہمارے گھر میں بڑے ناز و نعم سے پرورش پانے لگا۔ اس کے لئے بستر بنے۔ طرح طرح کے پٹے تیار ہوئے۔ اس کے غسل کے لئے خاص قسم کے صابن تولئے اور کمبل خریدے گئے اور جتّے کو باقاعدہ اس کی خدمت کے لئے ملازم رکھا گیا۔ میں جانتا تھا کہ امّی یہ سب کچھ ربابہ کی خاطر کر رہی ہیں مگر ربابہ کو ان کی ناز برداریوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ وہ جھنگے کو مجھ سے بھی زیادہ کچھ سمجھنے لگی۔ جھنگے کی خوراک تیار کرنے میں اگر ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو گھر میں اودھم مچا دیتی۔ ملازم بے چارے سخت پریشان تھے۔ جتّے کو تو معمولی سی غفلت پر روزانہ پیٹ ڈالتی۔

جھنگے کو روزانہ دوپہر کو صابن سے غسل کرایا جاتا تھا اور خوشبودار کریم بدن پر مل کر اوپر سے برش کیا جاتا اور جس رنگ کا لباس وہ خود پہنتی اسی رنگ کا پٹہ اسے بھی پہنایا جاتا۔ اسی رنگ کی نکیل اس کی ناک میں ڈالی جاتی اور اسی رنگ کی کیوٹیکس سے اس کے ناخن پالش کئے جاتے اور وہ اس کی مہار

پکڑے ساتھ لئے پھرتی۔

چنانچہ وہ خوراک کے سر پہ چھ ماہ کے اندر اندر اس حیرت انگیز اور غیر متوقع طور پر بڑھا کہ اپنے باپ سے بھی سوایا معلوم ہونے لگا۔ ایک دن سہ پہر کو ہم چائے پی رہے تھے اور ہنگا بھی تھوڑی دور ہٹ کر اپنی چھوٹی سی تپائی پر بیٹھا تھا۔ حسنے نے اس کا برتن لانے میں کچھ دیر کی تو ربابہ بہت جھلائی اور جھٹ میز پر سے پرچ پیالہ اٹھایا اور اس میں چائے ڈال کر ہنگے کے سامنے رکھدی۔ مجھے بڑی کراہت آئی۔ اور میں نے امّی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں آج سے ہوٹل میں کھانا وغیرہ کھایا کروں گا کیونکہ غلیظ جانوروں کے جھوٹے برتنوں سے مجھے گھن آتی ہے"۔

امّی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ان کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود اس مکروہ حرکت سے بیزار ہیں۔ لیکن ربابہ تنک کر کہنے لگی۔

"کیوں یہ کیسے غلیظ ہو سکتا ہے۔ روز صابن سے نہلایا جاتا ہے۔ آپ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اگر یہ حقیر ہے تو میں بھی حقیر ہوں۔ میرے ساتھ بھی نہ کھایا کرو"۔

اس پر میں نے ربابہ کو جھڑک دیا۔ میری جھڑک سن کر ربابہ تو بسورنے لگی مگر ہنگا بگڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور خونخواری ٹپکنے لگی۔ نہ جانے اس نے یہ بات کیسے سمجھ لی۔ اسی اثناء میں حسنہ بھی پہنچ چکا تھا جس نے خطرے کا احساس

کرتے ہوئے اس کی نکیل کھینچ لی اور وہ مجبوراً بیٹھ گیا۔ مگر اُس کی آنکھوں کی پتلیاں دیر تک پھیلتی اور سکڑتی رہیں جیسے کبھی بچپن میں خودربابہ کی پھیلا اور سکڑا کرتی تھیں۔ پس اس دن سے وہ میرا ایسا دشمن بنا کہ جب کبھی مجھے دیکھتا اسکی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے اور سکڑنے لگتیں اور وہ غرّانے لگتا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ حتیٰ کہ جھنگا سوا سال کا ہو گیا۔

۸

سردیوں کا آغاز تھا۔ ڈاکٹر طارق امسال موسم سرما گزارنے کے لئے لائل پور آگیا۔ اس نے جھنگے کو دیکھ کر نفرت کا اظہار کیا اور پھر جب اسے میری اور جھنگے کی دشمنی کا حال معلوم ہوا تو اُسے بڑا طیش آیا۔ وہ مجھے ملامت کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجید میں نے تمہیں پہلے دن ہی کہدیا تھا کہ اس لڑکی کو لاڈ نہ دینا۔ اب اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو اس ریچھ کو فوراً یہاں سے نکال دو۔ ورنہ ایک نہ ایک دن یہ تمہاری جان لے کر چھوڑے گا۔"

اتفاقاً اس وقت جھنگا بھی یہیں موجود تھا۔ اس نے یہ سب باتیں پھر سمجھ لیں۔ وہ ڈاکٹر پر اس قدر اچھل اچھل کر غرّانے لگا کہ حسنہ اُسے بمشکل قابو کر سکا۔ ڈاکٹر اس واقعہ سے بہت خوفزدہ ہوا۔

اب ہم سب نے یہی فیصلہ کیا کہ ٹھینگے کو علیحدہ کر دیا جائے مگر امّی اور چچا نقی رباب کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی مناسب ترکیب سے اسے رباب سے جدا کیا جائے۔ سوامیؔ نے یہ تجویز پیش کی کہ پہلے کوئی اور ریچھ کا بچّہ خرید لیا جائے پھر ٹھینگے کو نکالا جائے تاکہ رباب بہلی رہے۔ ڈاکٹر کو مجبوراً ماننا پڑا لیکن اس نے حفاظت کے طور پر ریوالور پاس رکھنا شروع کر دیا۔

اس بات کو چند ہی دن گزرے تھے۔ امّی ابھی ٹھینگے کا نعم البدل بھی نہ پا سکی تھیں کہ میں ایک دن دفتر سے واپس آیا تو حسّہ اس وقت ٹھینگے کو غسل کے بعد تولئے سے پونچھ رہا تھا۔ میں اپنے خیال ہی میں اندر گیا۔ اور جونہی ٹھینگے کے قریب سے گزرا تو یک دم وہ مجھ پر جھپٹا۔ حسّے نے زور سے نکیل کھینچی مگر وہ پورے قد سے بھی سوایا ریچھ، دلیہ کا دیو، بھلا اس بچے کو کیا سمجھتا تھا۔ اس نے پنجہ مار کر نکیل اس کے ہاتھ سے چھین لی اور پوری طاقت سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس اثناء میں بھاگ کر برآمدے کے قریب پہنچ چکا تھا مگر اس نے آکر وہیں دبوچ لیا۔ سارے گھر میں چیخ پکار پڑ گئی۔ مگر نزدیک کون آتا۔ عین اسی وقت ٹھاس کی آواز آئی۔ ٹھینگا اچھل کر پیچھے ہٹا میں اس کے چنگل سے نکل گیا اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر دوبارہ حملہ کرے دوسری دفعہ پھر ٹھاس کی آواز آئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ٹھینگے کی کن پٹی پہ پڑی۔ گولی ہڈی کو توڑ کر دوسری

طرف نکل گئی اور مہنگا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

مہنگے کے اس وحشیانہ حملے سے میں کچھ زیادہ مجروح تو نہ ہُوا۔ البتہ دہشت اس قدر غالب تھی کہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ میرے گھر کے لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر بھی ان میں شامل تھا جس کے داہنے ہاتھ میں ریوالور ابھی تک موجود تھا۔ اب میں سمجھ لیا کہ کس کی مہربانی سے میری جان بچی اور مہنگے کا قاتل کون ہے۔

خیر ان سب نے مل کر مجھے اُٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئے۔ ادھر ربابہ جو ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ بجائے میرے پاس آنے کے جھٹ جا کر مہنگے کی لاش پر گر گئی اور اس سے لپٹ لپٹ کر رونے اور واویلا کرنے لگی۔ غرضیکہ اندر میری سلامتی جان پر مبارک و سلامت ہو رہی تھی اور باہر وہ مہنگے کا ماتم کر رہی تھی۔ آج میرا دل اس سے بہت کھٹا ہُوا بلکہ سب گھر والوں کو ناگوار گزرا۔ اس دن سے ڈاکٹر نے پھر ربابہ پر سختی شروع کر دی جس سے وہ کچھ دنوں میں راہِ راست پر آ گئی۔

ڈاکٹر موسم سرما گزار کر چلا گیا اور ربابہ نے پھر اپنی حالت بدلنی شروع کی۔ اسی طرح سال گزر گیا۔ انہی دنوں میں ایک دن مجھے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ربابہ اور سجاول کے معاشقانہ تعلقات کے چرچے ہو رہے ہیں۔ اس کی کچھ روک تھام ہونی چاہئے۔ میں نے یہ خط امی کو دکھایا۔ مگر انہوں نے کانوں

پر ہاتھ رکھے کہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں. کچھ دن کے بعد میرے ایک دوست نے بھی مجھے اشارتاً ادھر توجہ دلائی۔

خلافِ معمول ایک دن میں دفتر سے ذرا پہلے ہی گھر چلا آیا تو گھر میں نہ امی تھیں نہ ربابہ اور نہ چچا نقی۔ میں نے ملازم سے ان کی بابت دریافت کیا۔ تو کچھ اُلٹے پلٹے عذر و بہانے کرنے لگا۔ جس پر مجھے شک پڑ گیا۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کی کہ سچ بتاؤ۔ گھر کے لوگ کہاں گئے ہیں۔ آخر اس نے بتایا۔

"چھوٹی بیگم صاحبہ روٹھ کر حسنیٰ کے گھر چلی گئی ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ حالانکہ میں انہیں بلانے بھی گیا تھا۔ پھر چچا نقی گئے۔ ان کے ساتھ بھی نہ آئیں۔ اب بڑی بیگم صاحبہ اور چچا نقی دونوں وہاں گئے ہیں"۔

میں نے پوچھا "مگر وہ روٹھی کیوں تھیں"؟

اس نے کہا "حضور وہ اکثر چوری چوری اور بعض اوقات زبردستی حسنیٰ کے گھر چلی جایا کرتی تھیں۔ آج بڑی بیگم صاحبہ نے ان کو ذرا سختی سے روکا تو انہوں نے لڑائی شروع کر دی اور پھر لڑ بھڑ کر چلی گئیں"۔

اتنے میں امی اس کو ساتھ لئے ہوئے واپس آ گئیں۔ حسنیٰ بھی ساتھ تھی۔ مجھے اس کی حالت پر سخت افسوس ہوا۔ اور میں نے امی سے کہا۔

آپ ناحق اس کو لاڈ دے کر خراب کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ تھوڑی بہت سختی ہونی چاہیئے"۔

امّی نے کہا "مگر میں اس حالت میں اس پر کبھی سختی نہ کروں گی اور نہ کسی کو سختی کرنے دوں گی۔ کیونکہ اسے دو ماہ سے خدا نے امیدواری دی ہے۔"

میں نے کہا "تو آپ چاہتی ہیں کہ بچہ ضرور پیدا ہو۔ چاہے وہ سجادل ہی کا ہو۔"

امّی نے تندی سے کہا۔ "ہرگز نہیں۔ سجادل ایسا ویسا آدمی نہیں وہ بڑا اصل ذات لڑکا ہے۔ آج میں نے ان کے گھر میں اُس روز والے خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس پر سجادل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے قرآن اُٹھا کر کہا۔ کہ ربابہ میری بہن کے برابر ہے۔ اگر میں اسے بری نظر سے دیکھوں تو آنکھیں ہی پھوٹ جائیں۔ وہ تو مجھے ایک عرصہ سے کہہ رہا ہے کہ ربابہ کا ان کے گھر جانا کوئی خرابی پیدا کرے گا۔ جس کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔"

اس واقعہ کے بعد جلدی ہی ڈاکٹر طارق موسم سرما گزارنے کے لئے آ گیا۔ ربابہ پھر دب گئی۔ وہ اب ہر وقت رنجیدہ اور بے جان سی پڑی رہتی تھی رفتہ رفتہ اس کے خوشرنگ چہرے کی گلابی رنگت پھیکی پڑتی گئی اور رخساروں پر بھوری بھوری چھائیاں پڑ گئیں۔ تاہم اس کے حسن میں فرق نہ آیا بلکہ کمزوری نے اس کی جسمانی نزاکتوں کو اور بھی نمایاں کر دیا اور چہرہ بجائے گلاب کے پھول کے چنبیلی کا پھول بن گیا جس پر وہ بھوری بھوری چھائیاں بھنورے کی طرح لگی ہوئی تھیں۔ اس کی چھائیوں کو دیکھ کر بعض اوقات دھوکہ ہوتا تھا کہ یہ

مصنوعی بنائی گئی ہیں۔

حسن ایک ایسی چیز ہے۔ جو لوہے کو بھی موم بنا سکتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب وہ بے بسی اور غمگینی کی حالت میں ہو۔ پھر میں تو اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ اس لئے مجھے بہت تردّد ہوا۔ اب رباب کو تیسرا مہینہ تھا مگر اس کا پیٹ کافی بڑا ہو چکا تھا۔ آخر جب اُسے چوتھا مہینہ لگا تو درد شروع ہو گیا۔ یہ وہی موقع تھا کہ جب ہمیشہ اسے اسقاط ہو جایا کرتا تھا۔ امّی کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ انہوں نے جھٹ حسنی کو بلایا۔ اور اٹھراہ کا منکہ رباب کے ٹخنے میں باندھ دیا گیا۔

خدا کی شان منکہ باندھتے ہی اس کی تکلیف جاتی رہی۔ لیکن وہ روز بروز اٹھنے بیٹھنے سے ناچار ہوتی گئی کیونکہ پیٹ اب اس کی بساط سے دگنا ہو گیا تھا سب کا خیال تھا کہ اس کے پیٹ میں دو بچے ہیں۔ امّی اس کے غم میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ آخر انہوں نے ایک دن مجھ سے کہا۔

"مجید رباب جانوروں کی بہت شائق تھی۔ لہٰذا تندرستی کی حالت میں تو میں نے اُسے سختی سے روکے رکھا مگر اس حالت میں۔ میں اس کا دل نہیں توڑ سکتی۔ چنانچہ کل جب اس نے مجھ سے دھنے کا کھیل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں انکار نہ کر سکی۔ اب میں نے حسنی سے کہدیا ہے کہ دونا ذبیدہ کو سمجھاوں اور دھنے کو یہاں لاکر رباب کو کھیل دکھا جایا کرے"۔

میں بھی اس کی بیماری کا خیال کرتے ہوئے انکار نہ کر سکا اور اس دن سے سجاول روزانہ دھنے کو لے کر آنے لگا۔ لیکن اب وہ پہلے سے بھی زیادہ میری آنکھوں میں کھٹکتا تھا کیونکہ اس نے اپنی وضع قطع ایسی مشتبہ بنا رکھی تھی اور رنگ ڈھنگ ایسے اختیار کر رکھے تھے کہ خواہ مخواہ اس سے طبیعت منغض ہو جاتی۔ یعنی کھدر کے تہہ بند کی بجائے اب اس کے بر میں لاچا بندھا ہوا تھا جس کے نیچے بالشت بھر ریشمی حاشیہ لٹکتا تھا، گلے میں بوسکی سلک کی لمبی قمیض، اس پر سیاہ ساٹن کی فتوحی، سر پر سیاہ ٹسر کا پٹکا جس کے دونوں سروں پر جالی دار جھالر بنی ہوئی تھی، سر پر یورپین عورتوں کی طرز پر کٹے ہوئے اور روغن حنا سے چپڑے ہوئے بالوں کے پٹے، ان میں اُلجھی ہوئی سیاہ سینگ کی کنگھی، جس میں چاندی کی گھنگریاں لگی ہوئی تھیں، کنڈلدار مونچھیں اور کانوں میں چاندی کے بجائے سونے کے مندرے، گلے میں سونے کا تعویذ جو کالے دھاگے میں پرو دیا گیا تھا، کلائی پر گھڑی، بازو پر چاندی کا ڈھولنا جس کے نیچے لٹکتا ہوا سیاہ ڈورا، جو نصف آستینوں والی قمیض سے باہر نکلا پڑا تھا، پاؤں میں تلّے دار جوتی، غرضیکہ اس نے اپنے دہقانی فیشن اور دیہاتی بانکپن میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی بلکہ اُس کی نفاست پسندی کا یہ حال تھا کہ اس کی ڈگڈگی پر بھی خاص قسم کا رنگ و روغن اور نقش و نگار کئے گئے تھے۔ اس کے دھنے کی نکیل بھی سنہرے موتیوں کی بنی ہوئی تھی اور دھنے کے ناخن بھی

کیوٹیکس سے رنگے ہوئے تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ سجاول میرے ہی سر پر پریکٹس کر رہا ہے۔ پھر مجھ سے نمک حرامی کر کے میری بیوی کو ہی لٹو بنائے تو مجھے صدمہ کیوں نہ ہو۔ آخر ایک دن میں کمرے میں تھا کہ سجاول کی ڈگڈگی کی آواز سنائی دی۔ ربابہ برآمدے میں پلنگ پر پڑی تھی اتی وہاں موجود نہ تھی نہ چچا نقی۔ ایک طرف کونے میں ڈاکٹر طارق کرسی پر بے خیالی میں بیٹھا نہایت اطمینان سے سگار کے کش لگا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ اپنی چندیا پر پھیرتا جاتا تھا اور خالہ جمیلہ اس کے پاس اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر کے کوٹ میں بٹن ٹانک رہی تھی۔ ادھر ناچ کھلاڑی دھنک دھنّا" شروع ہوا۔ لیکن انہوں نے پروا نہ کی وہ اپنے ہی خیال میں رہے۔ میں باہر تو نہ نکلا البتہ ڈاکٹر طارق کے پاس کھڑا ہو کر سجاول کی انوکھی سج دھج کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ دھنا نہایت جانبازی سے اپنے کرتب دکھا رہا تھا۔ یکایک سجاول کی ڈگڈگی کچھ مدھم پڑ گئی اور دھنے کا ناچ بھی کچھ دھیما پڑ گیا۔ سجاول اور ربابہ میں اشارہ بازی ہونے لگی اور اس صفائی سے یہ کام ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر طارق اور خالہ جمیلہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی مگر میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہ گیا۔ اب میرا دل ربابہ سے بہت ہٹ گیا اور اس کے بچے کی بھی کوئی خواہش باقی نہ رہی۔

اسی رات کو ربابہ پھر بیمار ہو گئی۔ لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اس نے کہا بچہ ایک ماہ کا ہے مگر غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ خیر اس کے علاج سے درد کو تو افاقہ ہوا لیکن تمام جسم سوج گیا۔ اور اس کا ایسا برا حال ہو گیا کہ بغیر کسی کی مدد کے پہلو بھی نہ بدل سکتی تھی۔ اس پر لیڈی ڈاکٹر نے ایکس رے کی صلاح دے دی ایکس رے کے ذریعے پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں کوئی عجیب الخلقت بچہ ہے۔

اس وحشت اثر خبر سے سوائے میرے اور ڈاکٹر طارق کے سب لوگ ہراساں ہو گئے۔ میری منافرت کی تو خاص وجہ تھی مگر نہ معلوم ڈاکٹر طارق کیوں اپنی لڑکی کے دکھ درد سے اس قدر بیگانہ تھا۔ الغرض امی اور چچا نقی وغیرہ نے فیصلہ کیا کہ ربابہ کو لاہور لے جا کر لیڈی جین ہسپتال میں داخل کرایا جائے۔ میں بھی متفق ہو گیا کیونکہ میں خود اسے چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ان قلندروں سے پیچھا چھوٹے۔

چنانچہ اسے بذریعہ کار لاہور پہنچایا گیا اور میں ان لوگوں کو وہاں چھوڑ کر خود لائل پور واپس آگیا۔ میں اپنے تھکے ہوئے دماغ کو آرام دینا چاہتا تھا تاکہ اطمینان سے اپنی آئندہ زندگی کے حالات کو درست بنا سکوں۔

امی کے خط روزانہ آتے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تمام جسم متورم ہو چکا ہے۔ آخر ایک مہینہ کے بعد مجھے تار ملا کہ ربابہ کے اپریشن کے ذریعہ

بچّہ پیدا ہوا ہے۔ چھٹی کے لئے لکھا۔ ہنوز چھٹی کا کوئی جواب نہ آیا تھا کہ ایک دن فون ہوا کہ ربابہ کی حالت نازک ہے فوراً آؤ۔ یہ خبر سنکر مجھے بہت افسوس ہوا پرانی محبت عود کر آئی۔ میں چھٹی کا انتظار کئے بغیر لاہور چلا آیا۔

ربابہ کو دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ گو اس کا تمام جسم متورم تھا مگر اس کا حسین چہرہ بدستور گیس کی طرح روشن تھا اور آنکھیں معمول سے زیادہ بڑی اور صاف نتھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اور تو اس کے مرنے کی کوئی علامت نہ تھی البتہ سانس کچھ چھوٹا اور تیز چل رہا تھا چونکہ اس کا اپریشن گھر پر ہی ہوا تھا اس لئے گھر کے لوگ اس کے اردگرد جمع تھے۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ جلد اچھی ہو جائے گی۔ شام تک اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ وہ باتیں کرنے لگی اور اس نے سجاول سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جسے امّی نے فوراً مان لیا اور میں بھی اس کی خطرناک حالت کا احساس کرتے ہوئے دم نہ مار سکا۔

صبح سویرے ہی امّی نے چچا نقی کو لائل پور روانہ کیا۔ دوسرے دن صبح وہ سجاول کو ساتھ لے آیا۔ سجاول کمرے میں داخل ہوا تو ربابہ نے اس کو پہچان لیا اور اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا۔ میں بھی اس کے قریب کھڑا تھا۔ ربابہ نے کہا۔

"سجاول دھنّے کا کیا حال ہے۔"

سجاول نے کچھ جواب نہ دیا۔ ربابہ نے دوبارہ کہا۔

"دیکھنے کو کیوں نہیں لائے"۔

سجاول نے کہا۔ "وہ بہت دور ہے۔ جب تم اچھی ہو جاؤ گی تو اس کو ضرور لاؤں گا"۔

ربابہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "آہ وہ بہت دور ہے۔ میرا دیوتا، میرے بچے کا باپ!!

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر گئیں، آواز رک گئی، اور روح پرواز کر گئی۔

اس کے آخری لفظ شاید اور کسی نے سنے یا نہ سنے ہوں مگر میں نے صاف طور پر سن لئے مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر دماغ زور سے گھوما اور فوراً ہی ایسا معلوم ہوا کہ بجلی کی زبردست کرنٹ دماغ پر پڑی ہے۔ اور میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ گھر کے لوگ کلمۂ شہادت اونچی آوازیں پڑھ رہے تھے۔

۹

اس صدمے نے میرے دماغ پر ایسا برا اثر کیا تھا کہ کئی دن تک میرا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا۔ آخر جب میری قوتِ یادداشت برقرار

ہوئی تو رات کا وقت تھا۔ برقی قمقمے جگمگا رہے تھے اور سارا کنبہ میرے پاس موجود تھا۔ میں نے پوچھا۔

"ربابہ کہاں ہے"۔

ڈاکٹر طارق نے کہا "دوسرے کمرے میں ہے"۔

میں نے کہا "نہیں وہ تو مر چکی ہے"۔

ڈاکٹر طارق نے کہا۔ "کون کہتا ہے"۔

میں نے کہا "میں خود کہتا ہوں کہ وہ مر گئی ہے۔ اور اچھا ہوا کہ وہ مر گئی ہے میں خوش ہوں"۔

ڈاکٹر طارق نے بھی وہی جواب دیا "ہاں اچھا ہوا وہ مر گئی ہے۔ میں بھی بہت خوش ہوں"۔

میں نے کہا "مگر آپ کی تو بیٹی تھی"۔

اس نے کہا "ہرگز نہیں"۔

میں نے کہا "آپ اپنی زبان سے اسے بیٹی کہا کرتے تھے"۔

اُس نے جواب دیا۔ "لوگ جو کچھ کہتے تھے میں سن لیتا تھا"۔

"تو پھر کس کی بیٹی تھی"۔ میں نے دریافت کیا۔

ایک ریچھ کی ایک عورت کے پیٹ سے۔ میں نے یہ راز آج تک جمیلہ کا دل رکھنے کے لئے کسی پر ظاہر نہ کیا تھا۔ لیکن تم میرے دوست کے بیٹے ہو اور

تمہیں اس دخترِ خرس سے محبت بھی تھی۔ اس لئے تمہاری زندگی برقرار رکھنے کی خاطر یہ راز ظاہر کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی یاد بالکل تمہارے دل سے مٹ جائے اور اس بات کو ظاہر کرنے کی اب جمیلہ نے بھی اجازت دے دی ہے۔

"سنو جب میں فوج میں ملازم تھا تو میری ملاقات ڈاکٹر جونی سے ہوئی یہ شخص بہت قابل تھا اور سائنسدان طبقہ کی ایک ایسی سوسائٹی کا رکن تھا جو اپنے نئے نئے مشاہدوں ایجادوں اور حیرت انگیز کمالات سے دنیا میں نئے نئے انکشاف کرنے کے دعویدار تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی اختراعات تھا۔

جونی مجھ سے بہت مانوس تھا۔ چنانچہ جب میں ریٹائرڈ ہو کر گھر آیا تو یہ بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ یہ شخص بہت مالدار تھا۔ ہم دونوں نے مل کر رانی کھیت میں کوٹھی بنوالی اور اکٹھے رہنے لگے۔ اس وقت رانی کھیت اتنا بارونق نہ تھا۔ وہ اپنے تجربات میں مصروف ہو گیا اور میں نے جمیلہ سے شادی کر لی چونکہ میں سیر و شکار کا حد درجہ شائق تھا اس لئے میں نے جمیلہ کو بھی اس شغل میں شریک کر لیا۔ اکثر دونوں شکار کو چلے جایا کرتے اور کئی کئی دن باہر ہی گزار دیتے۔

"ایک دفعہ میرے شکاری ملازموں نے اطلاع دی کہ ایک جوڑا ریچھ کا آجکل قرب و جوار کے جنگلوں میں آیا ہوا ہے۔ گو یہ چھوٹی نسل کا ریچھ تھا۔ مگر

بہت خونخوار تھا۔ یہ خبر سنکر ہماری باچھیں کھل گئیں اور ہم دونوں شکار کو روانہ ہوئے۔ کئی دن کی دوڑ دھوپ کے بعد کہیں وہ جوڑا قابو میں آیا۔ صرف مادہ مری اور زخم خوردہ نر بھاگ گیا۔

"رات ہم نے جنگل میں جھونپڑی کے اندر کاٹی۔ صبح سویرے ہی میرے ملازموں نے بتایا کہ جھونپڑی سے تھوڑی دور ہی ریچھ کے پنجوں کے نشان موجود ہیں۔ میں ان کے ہمراہ وہ نشان دیکھنے نکلا۔ جمیلہ اس وقت سو رہی تھی میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی ہم لوگ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ جھونپڑی سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ ہم بدحواسی سے اُلٹے پاؤں لوٹے مگر جھونپڑی خالی تھی۔ زخمی ریچھ جمیلہ کو لے جا چکا تھا۔

"میں نے سُن رکھا تھا کہ نر ریچھ عورت کا بڑا شائق ہوتا ہے۔ وہ اسے ہلاک نہیں کرتا بلکہ محبوبہ بنا کر رکھتا ہے۔ مجھے جمیلہ سے محبت تھی اس لئے میں نے اُسے ظالم کے پنجے سے چھڑانے کا تہیہ کر لیا۔ اس کوشش میں نے جان لڑا دی۔ آخر آٹھ ماہ کی جاں سپاری اور انتھک کوشش کے بعد اسے ہلاک کر سکا اور اس کے ہلاکت کے بعد گرد و نواح کی کھوہیں تلاش کرنے پر جمیلہ بھی مل گئی۔ وہ زندہ تو تھی مگر مردوں سے بدتر۔ وہ بالکل نحیف و لاغر ہو رہی تھی اور ریچھ نے اُس کے پاؤں کا گوشت زبان سے چاٹ چاٹ کر نماٹب کر دیا تھا اور پاؤں کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں تاکہ وہ بھاگ

نہ سکے۔

"غرضیکہ اسکی حالت اتنی خراب و خستہ ہو رہی تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آخر ڈاکٹر جوئی نے مجھے تسلّی دی اور اُسی کے علاج سے اس کی جان بچی۔ لیکن اُس کے پاؤں اچھے نہ ہو سکے۔ ان کی نچلی جلد اتنی پتلی اور بے جان ہو گئی تھی کہ اب تک وہ اپنے پاؤں پہ کھڑی نہیں ہو سکی اور ہمیشہ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں نکلتی رہتی ہیں۔

پھر انہی دنوں مجھے جمیلہ نے بتایا کہ وہ چار ماہ سے حاملہ ہے۔ یہ خبر سنکر میری تشویش اور بھی بڑھ گئی۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد یہ حیوانی بچہ ضائع کر دیا جائے مگر ڈاکٹر جوئی نے مجھے اس حرکت سے روکا اور اس بچے کا طالب ہُوا کیونکہ اس کے قابل دماغ کو ایک عجیب بات سوجھی کہ اگر وہ اس حیوانی بچّے کو اپنے سائنس کے کمال سے انسان بنانے میں کامیاب ہو گیا تو دنیا کو منوائے گا کہ محققین کا خیال غلط نہ تھا کہ کوئی خاص حیوان ارتقائی منازل طے کر کے آج کل کا انسان بنا ہے۔ اس سے اس پہ ایک لمبا چوڑا لیکچر بھی دیا۔ چونکہ یہ ایک دلچسپ مضمون تھا مجھے بھی اُس کا شوق ہو گیا۔

آخر ربابہ پیدا ہوئی۔ اس کا باپ چونکہ چھوٹی نسل کا بچہ تھا۔ اس لئے یہ پورے نو مہینے ایامِ حمل گزار کر آسانی سے پیدا ہوئی۔ اس کا صرف

چہرہ انسانی تھا باقی تمام جسم ریچھ کا۔ ڈاکٹر جوڈی نے ایک آلہ تیار کیا تھا جس کے نیچے رات کو ربابہ ڈال دی جاتی اور رات بھر اُس پر خاص قسم کی شعاعیں پڑتی رہتی تھیں۔

اسی طرح پورا سال ناکامی میں گزر گیا۔ مگر اس کے بعد اُس کے جسم کے بال جھڑنے شروع ہو گئے۔ اور وہ انسانی صورت میں آگئی۔ رفتہ رفتہ اُس کے نوکیلے حیوانی اعضا بھی تبدیل ہو گئے اور صرف تبدیل ہی نہیں ہوئے بلکہ خوبصورتی کی مکمل تصویر بن گئے۔ لیکن دو چیزیں نہ بدل سکیں۔ یعنی ایک دماغ اور دوسری آنکھیں۔

اسی دوران میں ڈاکٹر جوڈی کی موت ہو گئی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر اس جدوجہد میں مصروف رہا۔ آخر بڑی دیر کے بعد میری محنت نے اثر دکھایا۔ ربابہ کی آنکھیں بھی انسانی آنکھوں کے اوصاف اختیار کر گئیں۔ باقی رہا دماغ جو بہت آہستگی اور ٹھہراؤ سے بحال ہو رہا تھا، ممکن تھا کہ کبھی وہ بالکل درست ہو جاتا۔ مگر تم بیچ میں اُلجھ پڑے۔ سو تمہاری رنجیدگی کی تاب نہ لاتے ہوئے میں نے اپنا معمول تمہارے حوالے کر دیا۔ لیکن اب ربابہ نے دھمنّے کی بچی جن کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور اگر پھر کوئی تمہارے جیسا انجان ضدی میرے راستے میں حائل نہ ہوا تو شاید ایک دن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں گا۔"

اُس کے بعد مجھے رباب کی لڑکی دکھائی گئی اس کا چہرہ رباب جیسا تھا اور باقی تمام جسم "ڈھنے کا۔

ناگ دیوتا

سہ پہر کا وقت تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی صحت بخش شعاعیں فضا میں خوشگوار حرارت پیدا کر رہی تھیں۔ نیلو فری آسمان پر شہابی رنگ کے ابر پارے رنگین آنچل کی طرح ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ سفید سمندری چڑیاں اپنے آبی گھونسلوں سے نکل کر سطحِ سمندر پر اس طرح مصروفِ پرواز تھیں جیسے حسین جل پریاں خوشنما لاجوردی لہروں پر رقص کر رہی ہوں۔

میں اپنے محبوب شغل پیراکی سے فارغ ہو کر ایک بلند اور تنہا مقام پر پھولوں

کے جھرمٹ میں بیٹھا سمندر کی لامحدود وسعتوں اور مسحور کن دلآویزیوں پر غور کر رہا تھا کہ اچانک میرے سر پر ایک دھچڑ سا لگا۔ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو ایک موٹی تازی مارواڑی آیا دکھائی دی جو ریشم کے ایک چھوٹے سے جال میں تیتریاں پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے کڑے تیوروں سے اُسے دیکھا وہ کھسیانی ہو کر بولی۔

"صاحب معاف کیجئے میں اپنی بدقسمت مالکہ کا غم غلط کرنے کے لئے تیتریاں پکڑ رہی ہوں"۔

میں نے اس کی بات کا کچھ خیال نہ کیا اور بے پروائی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کچھ دور ابھری ہوئی چٹان کے سرے پر ایک نہایت حسین لڑکی دکھائی دی جو دلگیر صورت بنائے خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے سامنے پتھر پر سفید جارجٹ کے مہین رومال کے نیچے دو چار تیتریاں تڑپ رہی تھیں اور پاس ہی کچھ پھول پڑے تھے۔

اس لڑکی کا دلفریب حُسن اور بھولی بھالی صورت دیکھ کر میں پھڑک اُٹھا اور قیاس انداز لگایا کہ یہی مارواڑی آیا کی مالکہ ہے۔ میں اس کے مسحور کُن حُسن کا نظارہ کرتے ہوئے جب قریب سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرات اس کے گلگوں رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

اس لڑکی کی آزردہ حالی میرے دل میں نشتر بن کر اُتر گئی۔ میری آہٹ

پر لڑکی چونکی اور آنسو خشک کر کے اس نے مجھے نگاہِ غلط انداز سے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کیا تھیں شرابِ حسن کے دو بڑے بڑے چھلکتے ہوئے پیالے تھے۔ میرا دل بے اختیار ہو گیا۔ مگر بلا وجہ وہاں ٹھہرنا آئینِ شرافت کے خلاف تھا، اس لئے کچھ آگے بڑھ کر ایک جگہ آڑ میں بیٹھ گیا۔ اس کی صورت میرے دل پر نقش ہو رہی تھی۔ جذبات میں ہیجان اور دماغ میں انتشار پیدا ہو رہا تھا اور میں مسلسل اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ کسی طرح اس کی قربت کا شرف حاصل ہو اور اسے میں اپنی آرزوؤں کا گہوارا بنا سکوں کہ یکایک پانی میں دھم سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میں نے فوراً اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو لڑکی چٹان پر موجود نہ تھی۔

موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے پھرتی سے سمندر میں چھلانگ لگائی۔ ڈبکیاں کھاتی ہوئی لڑکی نے دو دفعہ میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر ڈوبنے کی کوشش کی تاہم میں اسے بچا کر باہر نکال لایا۔ اتنے میں مارواڑی آیا بھی جو تیتریوں کے پیچھے کچھ دور چلی گئی تھی، ہانپتی کانپتی آپہنچی۔

ہم دونوں نے مل کر اُسے اوندھا لٹایا۔ پیٹ سے پانی نکل جانے پر اُسے کچھ ہوش آگیا اور کچھ دیر بعد وہ آیا کے سہارے اٹھی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر جھٹ اپنا بازو پیش کیا جسے لڑکی نے بغیر کسی حیل و حجت

کے قبول کر لیا۔

ہم لوگ نشیبی راستے سے گزرتے ہوئے سڑک پر پہنچے آپا نے ٹیکسی طلب کی اور ٹیکسی والے کو تاج محل ہوٹل کے لئے کہہ کر ہم لوگ اس پر بیٹھ گئے۔

ٹیکسی وہاں سے چل کر تاج محل ہوٹل پر رُکی۔ لڑکی میرا اور آپا کا سہارا لے کر ٹیکسی سے اُتری اور اسی طرح ہم لوگ ہوٹل میں داخل ہو کر کمرہ نمبر اٹھتیس تک پہنچے، جہاں وہ مقیم تھی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میری نظر اُن دو اجنبی لوگوں پر پڑی جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکی کے سرپرست ہیں انہوں نے جب مجھے اس کے پہلو بہ پہلو دیکھا تو متفکر اور متحیر سے ہوئے۔ لیکن آپا نے تمام واقعہ سنا کر ان کا تردد کچھ دور کر دیا۔ تاہم وہ مشکوک اور غلط انداز نظروں سے میری طرف برابر دیکھتے رہے۔

اس کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ ان میں سے ایک نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اپنے گھر کی طرف ہو لیا۔ گھر آتے آتے مجھے رات ہو چکی تھی۔ میں بستر میں پڑ کر سوچنے لگا کہ وہ لڑکی کیوں رو رہی تھی۔ اس نے خودکشی کا اقدام کیوں کیا۔ اُسے کیا دُکھ تھا۔ اس کی خاموشی جو ایک ناگوار حد تک پہنچی ہوئی تھی، کیا معنی رکھتی تھی۔

اسی سوچ بچار میں سو گیا اور خواب میں بھی اس لڑکی کو روتے ہوئے دیکھا۔

یہاں تک کہ صبح جب بیدار ہُوا تو وہی خیالات دامنگیر تھے۔ چنانچہ شام کو میں اس کی مزاج پرسی اور پُراسرار حالات کی آگاہی کے خیال سے تاج محل ہوٹل پہنچا۔ ابھی میں ہوٹل کے دروازے پر ہی تھا کہ لڑکی کے سرپرستوں میں سے ایک صاحب مل گئے۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور لڑکی کی طبیعت کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے میری طرف مشکوک انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے!"

میں نے ان سے لڑکی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اس وقت آیا کے ساتھ سیر کے لئے گئی ہے۔

ان کا یہ روکھا پھیکا جواب پاکر میں بہت آزردہ ہُوا اور اپنی تدبیر کی ناکامی پر آنسو بہاتا ہُوا پیچھے لوٹنے لگا۔ دل میں انواع و اقسام کے خیالات کروٹیں لینے لگے غرضیکہ امروز کی ناکامی کو فردا کی کامیابی پر موقوف کر کے گھر آگیا۔

تیسرے دن پھر شام کو تاج محل ہوٹل پہنچا۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے آیا سے ملاقات ہوئی۔ میں نے آیا سے لڑکی کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ آج صبح اس کا باپ اُسے یہاں سے لے کر اپنے وطن چلا گیا۔ کیونکہ لڑکی کا اقدامِ خودکشی اور تمہاری فریفتگی دونوں باتیں کسی خطرے کا پیش خیمہ تھیں۔

اس کی زبان سے یہ کلمات سنکر مجھ پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا مگر میں نے ذرا ضبط

سے کام لیتے ہوئے لڑکی کے حالات اور نام پتہ کے متعلق معلومات کی۔

آیا نے کہا اُس بدنصیب لڑکی کا صحیح پتہ تو معلوم نہیں البتہ وہ لباس و جسامت کے اعتبار سے پنجاب یا سندھ کے علاقہ کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔"

میں نے پوچھا "تم اسے بدنصیب کیوں کہتی ہو"

اس نے جواب دیا وہ اور اس کا باپ دونوں گونگے تھے"۔

اس انکشاف پر مجھے بہت رنج ہوا۔ میں نے کہا "تو شاید وہ اسی وجہ سے غمگین رہتی تھی"۔

آیا نے کہا "نہیں۔ میرے خیال میں کوئی اور وجہ ہوگی کیونکہ گونگے پن کا غم اتنا شدید نہیں ہو سکتا کہ کوئی جان سے بیزار ہو جائے"۔

میں نے آیا کے خیال کی تائید کرتے ہوئے مزید واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا۔

"ہاں اتنا اور جانتی ہوں کہ وہ اپنے باپ سے سخت متنفر اور خائف تھی۔

اس کی ان باتوں سے میرے اشتیاق میں اضافہ ہوگیا۔ لہٰذا میں نے ہوٹل کے منیجر سے اس معاملہ میں اعانت طلب کی۔ منیجر نے بتایا کہ اُن دو معزز آدمیوں میں سے ایک کا نام غنی اور دوسرے کا نام رستم تھا۔ لڑکی کا نام گوہر تھا یہ غنی کی لڑکی تھی اور یہ لوگ پنجاب کے ایک صحرائی علاقہ چاندنی باغ بھکر کے رہنے والے تھے۔

بنجر کی رہنمائی میرے حق میں خضر سے بڑھ کر ثابت ہوئی چنانچہ میں نے نہایت انہماک کے ساتھ سفر کی تیاری شروع کی اور قریباً ایک دو ہفتہ بعد اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر تلاشِ محبوب میں بھکر روانہ ہو گیا۔

۲

میں قریباً ایک ماہ بھکر میں مقیم رہا اور تمام علاقہ کی خاک چھان ماری مگر چاندنی باغ کا سراغ نہ ملا۔ آخر ایک دن ایک بلوچی مزدور سے معلوم ہوا کہ چاندنی باغ کوئی جگہ نہیں۔ البتہ قلعہ چاند باز ایک مقام ہے جو یہاں سے ساٹھ میل پرے ایک ویران ریگستانی علاقہ میں واقع ہے۔

ناچار مجھے اس بلوچی مزدور کے ہمراہ قلعہ چاند باز کی طرف کوچ کرنا پڑا بھکر سے قلعہ چاند باز تک ایک کچی اور ناہموار سڑک جاتی تھی۔ اور بیس میل تک سخت خشک ریگستان تھا۔ جہاں اردگرد کوسوں تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی ذریعہ تھا۔ راستے میں سوائے آک کی جھاڑیوں کے کوئی پودا یا درخت نام کو نہ تھا۔

خدا خدا کر کے بیس میل کا کٹھن راستہ طے ہوا اور ہم لوگ ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہیں ہم نے ایک بلوچی کے گھر رات گزاری اور صبح پھر سفر پر روانہ ہوئے۔

اب راستہ پہلے کی طرح بنجر نہ تھا۔ یہاں کریر کی جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ جو چھوٹے چھوٹے سرخ پھلوں سے بھرپور تھیں۔ گرگن بیر پہلوں سے جنگل بھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جو ہرنی راستے میں مل جاتے اکثر پانچ چھ میں کے فاصلہ پر کیکر کے درختوں سے گھرا ہوا ایک آدھ گاؤں بھی دکھائی دیتا۔ جس کے اردگرد کھیتی باڑی کے آثار بھی نظر آتے تھے۔

ستائیسویں میل کے بعد علاقہ زرخیز ہوتا گیا۔ سڑک کے دو رویہ پیلو اور کھجور کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ پیلو اس کثرت سے زمین پر بکھر رہے تھے کہ ان کی شراب انگیز بو سے تمام فضا لبریز ہو رہی تھی۔ یہ زمین زیادہ تر دلدلی تھی۔ نشیبی حصے اور گڑھے پانی سے لبریز تھے جن میں نیلوفر اور دوسری نباتات پھیل رہی تھی۔

اس علاقہ میں سانپ کثرت سے پایا جاتا تھا اور جگہ جگہ پرانے درختوں کے چھوٹے چھوٹے مندر کھڑے تھے جن میں ٹوٹی پھوٹی سانپ کی مورتیاں پڑی تھیں۔ ان مندروں سے قیاس لگایا جاتا تھا کہ زمانہ قدیم میں اس علاقہ کے باشندے مار پرست ہوں گے۔

ہم منزل بہ منزل سفر طے کرتے چلے گئے حتیٰ کہ ایک دن دور سے ہمیں ایک پہاڑی پر قلعہ چاند باز کی فصیلوں کے اونچے کنگرے دکھائی دیئے۔ پہاڑی کے دامن میں ایک بہت بڑا باغ تھا جس میں ہر قسم کے پھل دار

درخت موجود تھے اس باغ سے باہر سو کے قریب جھونپڑیاں تھیں اور باغ کے عین درمیان ایک سیاہ پتھر کی خوبصورت عمارت تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ اس جگہ کو چاندنی باغ کہتے ہیں۔

چاندنی باغ کا نام سُنکر مجھے بہت مسرّت ہوئی۔ شام ہو چکی تھی۔ میں ایک بلوچی کے گھر شب باش ہُوا۔ میرا میزبان بہت نیک اور مسافر نواز تھا۔ اس نے اونٹنی کے دودھ اور تازہ پھلوں سے میری تواضع کی۔

وہ دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ مگر اس نے نہ ہی میری اس آمد کی وجہ پوچھی نہ میرا نام اور پتہ دریافت کیا بلکہ پُر معنی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ آخر کار میں نے خود ہی سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اور اس سیاہ عمارت کا ذکر چھیڑا۔ میرے میزبان نے بتایا کہ یہ عمارت ایک انگریز ڈاکٹر کی تجربہ گاہ ہے۔ چونکہ اس علاقہ میں سانپ بہت ہوتے ہیں اس لئے وہ یہاں ان کے زہر کے متعلق تجربات کرتا ہے۔

دوسرے دن صبح میں اپنے میزبان کی وساطت سے ڈاکٹر کو ملنے گیا۔ ڈاکٹر پال پچاس سالہ خبطی انگریز تھا۔ یہ شخص حشرات الارض کا ماہر تھا۔ سانپوں کی قسمیں، عادات و اطوار اور ان کی زہر کے متعلق معلومات میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے بتایا کہ وہ بیس بائیس سال سے یہاں مقیم ہے اور دن رات انہیں تجربات میں مصروف رہتا ہے

ڈاکٹر ایسا خوش خلق اور شیریں زبان تھا کہ اس نے مختصر ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس نے مجھے اپنی تجربہ گاہ دکھائی جس کے ایک حصہ میں مہین آہنی جالیوں اور شیشے کے گھروندوں میں مختلف قسم کے سانپ پالے گئے تھے۔ اس کے پاس ایک بوڑھی خادمہ تھی جس کا جھرّی دار چہرہ بھنیسوں کی طرح سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخ تھیں جن سے مکاری ٹپکتی تھی۔

اس عورت کو دیکھ کر خواہ مخواہ دل میں وحشت اُٹھتی اور نفرت کا احساس ہونے لگتا۔ یہ عورت ان سانپوں کی محافظہ تھی۔ اس کا نام فاطمہ تھا۔ سانپ اس سے ایسے مانوس تھے جیسے پالتو کتے۔ اسے دیکھ کر وہ خوشی سے جھومنے لگتے اور اس کے بدن کو اپنی زبان سے چاٹتے

جتنی اس عورت کی شکل مکروہ تھی اتنی ہی اسکی طبیعت بھی روکھی پھیکی تھی۔ یہ ڈاکٹر کی دستِ راست تھی۔ وہ اسکی بہت قدر کرتا تھا۔

تجربہ گاہ دکھانے کے بعد وہ مجھے اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ گو ڈاکٹر نے بظاہر میرے یہاں آنے کی وجہ نہ پوچھی۔ تاہم مجھے قرائن سے معلوم ہوا کہ وہ میری اس صحرانوردی کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ چنانچہ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

میرے منہ سے گوہر کا نام سُنکر وہ کانپ اُٹھا۔

"خدا کی پناہ وہ تو ایک لعنت زدہ خاندان سے متعلق ہے اور اس سے ہمدردی کرنے والا بھی گرفتارِ لعنت ہو جاتا ہے۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد مجھے مزید حالات کا مشتاق پا کر کہنے لگا۔ اس خاندان کے متعلق صحرائی روایت اس طرح ہے کہ یہاں کسی زمانے میں چاندباز نامی ایک بلوچی ڈاکو رہتا تھا جو گرد و نواح میں لوٹ مار کر کے خلقِ خدا کو دکھ دیتا تھا۔ لیکن اتنی جدوجہد کے باوجود وہ اس علاقہ کا افلاس دُور نہ کر سکا کیونکہ یہ علاقہ بالکل خشک اور بنجر تھا۔

ایک دن نہ جانے کس طرح اس کی شیطان سے ملاقات ہو گئی جس نے سیم و زر کے عوض اس کی روح خرید لی اور اس دن سے وہ قوتِ گویائی سے محروم کر دیا گیا تاکہ وہ کسی سے یہ راز نہ کہہ سکے۔ مگر اس جہنمی عہد کے بعد وہ خزانوں کا مالک بن گیا۔ اس نے لوٹ مار ترک کر کے اپنے نام پر یہ قلعہ بنوایا۔ چنانچہ اس قلعہ میں سونا اور جواہرات اب تک اس بہتات سے ہیں کہ کسی بڑی سے بڑی ریاست کا خزانہ بھی اس کا ہم پلّہ نہیں ہو سکتا۔ گو یہ کئی صدیوں کی بات ہے مگر اب تک اس قلعہ کے جانشین پیدائشی گونگے ہوتے ہیں۔ اور شیطان ان کی روح کا مالک ہوتا ہے۔

میں نے ہنس کر کہا۔

"اس بیہودہ روایت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔"

اس نے کہا "میرے خیال میں یہ سب باتیں سچّی ہیں۔

ڈاکٹر جیسے قابل آدمی کی تصدیق سے میں گھبرا گیا۔ متواتر دو ماہ کی سرگردانی اور سفر کی تکان سے میں پہلے ہی پژمردہ ہو رہا تھا۔ اس خبر نے مجھے بہت ہی بادل کیا۔ اس پر ڈاکٹر نے مجھے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تم سفر کی صعوبتوں سے مضمحل ہو رہے ہو کچھ دن یہاں آرام کرو میرا غریب خانہ حاضر ہے۔"

مگر فاطمہ کی موجودگی کے خیال سے میں نے اس کی دعوت کو شکریہ کے ساتھ رد کر دیا اور دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

راستے میں پھاٹک کے قریب فاطمہ کھڑی تھی جس کی سُرخ سُرخ خونی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں اس کی نظروں سے بچتا ہوا اپنے میزبان کے گھر واپس آ گیا۔

میں تمام دن یہی سوچتا رہا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق اس لڑکی کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ انتہائی سوچ بچار کے بعد بھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ضرور اس لڑکی سے ملوں گا۔ اس دوران میں میرا میزبان جس کا نام اسمٰعیل تھا کئی دفعہ اس کمرے میں آیا اور مجھے سویا ہُوا سمجھ کر واپس چلا گیا۔

سہ پہر کو جب میں اُٹھا تو میرا میزبان جو میری آہٹ پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ جھٹ میرے لئے خمیری روٹی۔ اونٹنی کا دودھ اور کھجوریں لے آیا۔ میں نے

اس سے بھی گوہر کا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"اس تصورِ خام کو دماغ سے نکال دو اور اپنی جوانی پر رحم کھا کر واپس چلے جاؤ۔ جس چیز کی تلاش میں تم یہاں آئے ہو وہ محض روایتی ہے"۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"گوہر روایتی چیز نہیں تم غلطی پر ہو"۔

اس نے جواب دیا "گوہر کا یہاں ذکر ہی فضول ہے۔ میرا اشارہ اس چیز کی طرف ہے جس کی دراصل تمہیں تلاش ہے"۔

میں نے کہا "یعنی"۔

اس نے جواب دیا "یہ تم اپنے دل سے پوچھ سکتے ہو۔ میں کیا بتاؤں"۔

میں زچ ہو کر خاموش رہ گیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے مجھ پر کیا شک ہے اور نہ ہی اسمٰعیل نے اس نکتہ کی کوئی وضاحت کی۔

۳

رات کا چوتھائی حصّہ گذر چکا تھا۔ نئے چاند کی کمزور کرنوں میں صحرا کا سُنسان نظارا خالقِ ارض و سما کی عظمت و جبروت کا آئینہ تھا۔ کمرے میں میں اور میرا بلوچی مزدور جسے میں ہنگر سے ساتھ لایا تھا، اپنے اپنے بستروں پر پڑے تھے۔ سرسوں کے تیل کا چراغ اپنی مدھم لَو کے ساتھ جل رہا تھا جس کی

کانپتی ہوئی ضو میں ان پروانوں کے لمبے لمبے اور دھندلے سائے جو چراغ پر کثرت سے منڈلا رہے تھے۔ مکڑی کے لٹکتے ہوئے سیاہ جالوں سے مل جل کر کچّی دیواروں پر بھیانک نقش و نگار معلوم ہوتے تھے۔ دیواروں پہ بدنما چھپکلیوں کی یورش اور فرش پر چوہوں کی اچھل کود سے یہ جھونپڑا اچھا خاصا بھوت نواس معلوم ہوتا تھا۔

اسمٰعیل کی پُراسرار باتوں پہ دماغ سوزی کرتے ہوئے مجھے نیند آگئی۔ میں نہیں جانتا عالم بیداری تھا یا خواب۔ میں نے دیکھا کہ ایک سایہ پنجوں کے بل اس کمرے میں متحرک تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں۔

صبح جب میں بیدار ہُوا تو میرا بلوچی مزدور نہایت سہما ہُوا بیٹھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔

"صاحب مجھے رخصت دیجئے۔ اب میں یہاں نہ رہوں گا۔"

میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے دیکھا کہ ایک نہایت ڈراؤنی شکل کی چڑیل پنجوں کے بل کمرے میں پھر رہی تھی۔ لیکن وہ دم سادھے پڑا رہا۔ حتّٰی کہ کچھ دیر بعد وہ چڑیل اس کھڑکی کے رستے نیچے اُتر گئی۔

یہ بات سُن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رات والا سین میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ تاہم میں نے اس کی بات کو ہنسی میں اُڑا دیا اور

اسے تسلّی دی۔ مگر اس نے میری ایک نہ سُنی۔ مزدور کو جاتے ہوئے دیکھ کر اسمٰعیل کہنے لگا۔

میں اس آدمی کا بیان سنکر بہت متفکّر ہوں۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ تمہیں فوراً یہاں سے چلا جانا چاہیئے۔ کیونکہ قریباً چھ سال کا ذکر ہے کہ ایک پنجابی مجوسی یہاں آکر میرے ایک عزیز کے گھر ٹھہرا تھا۔ وہ بھی اسی چیز کی تلاش میں آیا تھا جس کے لئے تم آئے ہو۔ چند روز بعد وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔"

اس پر میں نے مقدّس قسمیں کھا کر اُسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ سوائے گوہر کی ملاقات کے میرا اور کوئی مقصد نہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا حالانکہ میری بات پر اُسے اب بھی اعتبار نہ تھا۔ آخر کچھ عرصہ سوچ کر اس نے کہا۔

"خواہ تمہارا کچھ بھی ارادہ ہو تمہیں کسی دوسری جگہ قیام کرنا چاہیئے۔"

میں نے پوچھا "دوسری کون سی جگہ"۔ "پہاڑی پر۔ خانگاہ میں۔" اس نے قلعہ کے مقابل والی پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس پر مسمار شدہ عمارات کے کھنڈر دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے کہا "اچھا آج وہاں چلا جاؤں گا۔"

اسمٰعیل نے کہا "بشرطیکہ خانقاہ والے تمہیں پناہ دیں۔ کیونکہ وہ کسی وسیلے کے بغیر تمہیں پناہ نہ دیں گے۔"

میں نے اس سے التجا کی کہ وہ میری مدد کرے۔ گہری سوچ کے بعد اس نے کہا۔

"اچھا تم کل یہاں سے رخصت ہو کر چھ کوس کے فاصلہ پر سڑک کے داہنی طرف کیکر کے جھنڈ میں میرا انتظار کرنا۔ میں شام کو وہاں آؤں گا اور خفیہ طور پر تمہیں خانقاہ والوں کے سپرد کر آؤں گا۔

میں نے اس کی پیش کردہ شرائط کو منظور کر لیا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح اٹھ کر میں نے تیاری کی اور جاتے ہوئے ڈاکٹر سے ملا۔ وہ میری فوری واپسی پر حیران رہ گیا۔ اس نے بڑے خلوص سے مجھے الوداع کہی اور پھاٹک تک میرے ساتھ آیا۔

جب میں باغ سے گزرا تو فاطمہ اس وقت سانپوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ اس نے بظاہر تو میری پروا نہ کی۔ مگر کنکھیوں سے برابر دیکھتی رہی۔ میں فوراً وہاں سے نکل آیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

صبح کافی خوشگوار تھی۔ صحرا کا سورج اپنی نورانی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ کہیں ساتویں آسمان میں گھسے ہوئے آوارہ ابر پارے پرشکوہ فلک سے جھانک رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے کھجور کے مضبوط اور نوکیلے پتوں سے ایک سریلی گونج سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں دو گھنٹے کے اندر اسمٰعیل کے بتائے ہوئے کیکر کے جھنڈ میں جا پہنچا جو ایک جوہڑ کے قریب واقع تھا۔

اور تمام دن اسی جھنڈ میں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ سورج غروب ہونے پر صحرا کی شفق آلود شام شب کی تاریکی میں کھو گئی۔ چھٹی تاریخ کا چاند گوشۂ فلک سے ٹکٹکی لگائے دنیا کے تغیرات کا مطالعہ کرنے لگا۔ سانپ جوہڑ کے کناروں پر رینگنے لگے۔ میں بے صبری سے اسمٰعیل کا منتظر تھا۔ رات کافی گہری ہونے پر وہ آیا۔ ہم دونوں نے پھلوں سے شکم پری کی اور بعد ازاں قلعہ کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ راستہ چاندی باغ سے بالکل مختلف تھا۔ اس راستے میں ایک دلدل عبور کرنا پڑتی تھی۔ میں گھوڑے پر تھا اور اسمٰعیل پیدل۔ قدم قدم پر سانپوں کا ڈر تھا مگر یہ لوگ اپنے بچاؤ کے گر جانتے تھے۔ وہ نہایت حکمت عملی سے مجھے یہاں سے نکال کر ایسے مقام پر لے گیا۔ جہاں ایک طویل و عریض صحرا میں آمنے سامنے دو پہاڑیاں تھیں۔ بڑی پہاڑی پر قلعہ چاندبانہ عفریت کی طرح ایستادہ تھا۔ اور چھوٹی پہاڑی پر شکستہ کھنڈر۔

اس صحرائی علاقہ میں چھوٹے چھوٹے چشموں کی صورت میں زمین سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ اس پانی کی گہرائی بالشت بھر سے زیادہ نہ تھی جو ریت کے شفاف ذروں پر نہایت آہستگی سے بہتا ہوا نوری پیراہن کی طرح لہرا رہا تھا

اسمٰعیل نے کہا۔

"یہ خیر و برکت کی سرزمین ہے۔ اس حلقہ میں سانپ کا گزر نہیں ہوتا۔"

یکایک صحرا کی نیم گرم ہوا کے کیف پرور جھونکوں کے ساتھ بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں دل و دماغ کو معطر کرنے لگیں۔ میں حیران تھا کہ اس اجاڑ بیابان میں ایسی خوشبو کہاں۔ مگر اسمٰعیل نے کہا کوئی کستوری والا ہرن قریب سے گزرا ہوگا۔

ابھی ہم چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ایک ریتلے ٹیلے کے قریب دُور سے ایک انسانی صورت دکھائی دی جو سفید براق لباس میں ملبوس تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اسمٰعیل جھٹ تعظیماً جھک گیا۔

چشم زدن میں وہ سایہ کہیں غائب ہوگیا۔ میں نے اسمٰعیل سے اس سفید پوش سائے کے متعلق دریافت کیا مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس مقدس صحرا میں رات کے وقت اکثر فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ اس کا یہ جواب پاکر مجبوراً مجھے خاموش ہونا پڑا۔

رفتہ رفتہ ہم لوگ اُس پہاڑی کے بالکل قریب پہنچ گئے اور مسلسل ایک گھنٹہ کی چڑھائی کے بعد چوٹی پر پہنچے۔ چوٹی پر تقریباً ایک میل مربع فراخ میدان تھا جس پر کریر کی جھاڑیوں اور نیم کے درختوں میں گھرے ہوئے کھنڈر اپنی گزشتہ عظمتوں کا رونا رو رہے تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا گاؤں تھا جو سو ڈیڑھ سو جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔

ہم کئی ایک شکستہ دروازوں سے چکر کاٹتے ہوئے ایک گنبد نما عمارت میں

داخل ہوئے جس کے دروازے پر زنگ آلود کوڑیوں کے سہرے لٹک رہے تھے۔ اندر ایک طویل اور اونچی قبر تھی جس کے سرہانے چراغ جل رہا تھا۔ اسمٰعیل نے بتایا کہ یہ سیّد الیاس کی خانقاہ ہے۔

مجھے اس خانقاہ میں بٹھا کر وہ خود باہر گیا اور بہت دیر بعد جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک عورت اور ایک مرد تھا۔ اس ہٹی کٹی صحت ور عورت کے کان چاندی کے بھاری بھاری بندوں کے بوجھ سے رخساروں پر لٹک رہے تھے۔ اس کے بالوں کی بڑی بڑی لٹیں جن سے تیل ٹپک رہا تھا کندھوں پر پڑی تھیں۔ مرد جو گلے سے ننگا تھا، کمر میں ایک بھاری تہہ بند باندھے تھا۔ اس نے اپنے سر پر اونٹ کے بالوں کا موٹا سا رسّہ پگڑی کی صورت میں لپیٹ رکھا تھا۔

اسمٰعیل نے مجھے ان لوگوں کے سپرد کر دیا۔ گو میں ان لوگوں کی ہیئت کذائی دیکھ کر گھبرا گیا تھا مگر قہر درویش بر جانِ درویش کے پیش نظر ان کا آسرا لینا پڑا۔

جب میں ان کی جھونپڑی میں پہنچا تو صبحِ صادق کا ظہور ہو چکا تھا۔ مجھے رات بھر کی تکان تھی۔ وہاں جا کر خوب سویا۔ بارہ بجے کے قریب جب بیدار ہوا تو دونوں میزبان میرے منتظر تھے۔ یہ دونوں با اخلاق اور متواضع تھے انھوں نے مکھن اور روٹی میرے سامنے پیش کی۔ کھانے کے بعد میں ان کے بچوں کے ساتھ

کھنڈرات کی سیر کو گیا۔ یہ بچّے بھی بہت باادب اور سمجھ دار تھے۔

جب میں شام کو واپس آیا تو میرے میزبان نے کہا۔ "چلئے حضرت، صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے خانقاہ سے ملحقہ کھنڈر میں لے گیا۔ یہ جگہ گو باہر سے بالکل بوسیدہ ہو رہی تھی مگر اندر سے اچھی حالت میں تھی۔ لمبے دالان کے پیچھے ایک حجرہ تھا جس میں شیر کی کھالیں بچھی تھیں۔ یہاں ایک پیر مرد سبز عمامہ باندھے بیٹھا تھا۔ میرا میزبان مجھے وہاں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

پیر مرد نے میرے آنے کی غرض و غایت دریافت کی۔ میں نے وہی جواب دیا جو پہلے اسمٰعیل وغیرہ کو دے چکا تھا۔ پیر مرد نے کہا۔

"عزیز بچے جس چیز کی تلاش میں تم آئے ہو وہ تو محض اشخاص کی من گھڑت روایت ہے۔ اس خیالِ خام سے باز آؤ۔"

میں نے نہایت ادب سے کہا۔ "میرے محترم مجھے سوائے گوہر کے کسی چیز کی تلاش نہیں۔"

کامل سکوت کے بعد پیر مرد نے کہا۔ "اچھا ایک ہفتہ تک انتظار کرو۔"

ایک ہفتہ کے بعد میرا میزبان پھر مجھے پیر مرد کے پاس لے گیا۔ اس نے کہا "تم گوہر کی خاطر آنکھوں پر پٹی بندھوا کر کہیں جانے پر رضامند ہو؟"

میں نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ چنانچہ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔

اور پیر مرد نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم کئی جگہ دار راستوں سے گزرتے ہوئے بیشمار سیڑھیاں اُتر گئے غرضیکہ تحت الثریٰ میں پہنچ کر پھر اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اور کچھ دیر تک کسی نیچی چھت کے نیچے چلتے رہے۔ بعد ازاں ایک کھلی جگہ میں پہنچے۔ یہاں میری آنکھوں سے پٹی اُتار دی گئی۔

میں نے دیکھا کہ ہم ایک تہہ خانہ میں کھڑے تھے۔ یہ تہہ خانہ مست کن خوشبو سے بھرا تھا۔ سارے تہہ خانے میں ایک شفاف اور بھڑکیلی روشنی پھیل رہی تھی جو طاقچہ پر رکھے ہوئے ایک پتھر سے نکلتی تھی۔ یہاں مجھے ایک مقدس ہستی دکھائی دی جو شیر کی کھال پر سیاہ چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ یہ ایک ضعیف عورت تھی۔ جس کے سفید چہرے پر خون کی چھینٹ تک نہ تھی۔ مگر اس کا سماوی جلال اس قدر زبردست تھا کہ میرا سر خود بخود اس کے سامنے جھک گیا۔

یکایک ایک نرم اور شیریں آواز سنائی دی۔

"میرے بچے جو چیز تم چاہتے ہو وہ دین و دنیا دونوں کے لئے تباہ کن اثرات رکھتی ہے"۔

ضعیفہ کے رعب و دبدبہ سے گویا میری زبان پر مہر لگ گئی۔ میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ ضعیفہ نے پیر مرد کو کچھ اشارہ کیا جو غار کے اختتام پر ایک پتھریلی سل کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔

پیر مرد نے فوراً پیچھے سے پتھریلی سل ہٹا دی۔ اس سل کے پیچھے ایک شگاف

تھا جو کسی اندھے غار کا دہانہ معلوم ہوتا تھا۔ عین اسی وقت نہایت خوفناک طور پر کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز جو اس غار سے آرہی تھی یا تو کسی پھانسی پہ لٹکے ہوئے مجرم کے گلے کی خرخراہٹ تھی یا کسی نیم بسمل کے سسکتے ہوئے لبوں کی آخری ہچکی۔ کوئی جاندار رکتی ہوئی آواز۔ گھٹے ہوئے گلے اور اکھڑی ہوئی سانسوں سے کراہ رہا تھا۔ ضعیفہ کمزور آواز میں کہنے لگی۔

"یہ ہے اس شخص کا مآل جس نے وہ چیز حاصل کی اور اس منحوس چیز کی بدولت صدیوں سے اس دردناک عذاب میں مبتلا ہے"۔

میں کانپ گیا۔ کرب و اضطراب اور تلخیٔ موت کے روح فرسا احساس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پیر مرد نے سل بدستور جما دی اور تہ خانے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ تھوڑے توقف کے بعد ضعیفہ کی آواز نے اس بھیانک سکوت کو توڑا۔

"میرے بچے اب تو تم کو ضرور اس منحوس چیز کا خیال چھوڑ دینا چاہئیے"۔

میں نے بمشکل اپنے حواس درست کئے اور گڑگڑا کر کہا۔ "مقدس ماں یہ سب کچھ میرے لئے ایک معمہ ہے۔ اور نہ ہی کسی ایسی چیز سے باخبر ہونا چاہتا ہوں۔ سوائے گوہر کی ملاقات کے مجھے کسی دوسری چیز کی خواہش نہیں"۔

ضعیفہ نے کہا "لیکن رستم نے تو اجنبی مسافروں کا یہاں داخلہ ہی بند کر رکھا ہے"۔

میں نے نہایت عاجزی سے دوبارہ التجا کی۔ اس پر ضعیفہ کچھ پسیج گئی اور اس نے پیر مرد سے پوچھا۔

"کیا کسی صورت سے یہ قلعہ میں جا سکتا ہے"؟ پیر مرد نے کہا۔ یہ صورت ہو سکتی ہے کہ اسے خفیہ طور پر قلعہ میں لے جا کر آسمانی باغ کی بوڑھی مالن کے سپرد کیا جائے۔"

ضعیفہ کہنے لگی۔"اچھا کل تمہیں مالن کے سپرد کر دیا جائیگا۔ باغ میں گوہر اکثر آتی ہے۔ وہاں تم اس سے مل سکو گے۔

پھر دوبارہ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور جس طرح وہاں گیا تھا، واپس خانقاہ میں لایا گیا۔

۴

چاندنی رات تھی ماہِ کامل کی سیمیں کرنوں کی تابندگی سے سطحِ خاکی پر نورانی بساط بچھی ہوئی تھی۔ اس طلسمی سرزمین پر ایک ہوشربا سکوت چھا رہا تھا۔ سامنے پہاڑی پر قلعہ چاند بانو کی پرشکوہ عمارت ہزاروں ہنگامہ خیز اور خونچکاں داستانوں کو اپنے سنگین دل میں چھپائے عقلِ انسانی پر خندہ زن تھی۔

میرا میزبان مجھے ایک دشوار اور پُرپیچ راستے سے ایک عظیم الشان دروازے تک لے گیا جہاں اس نے خاص طریقہ سے تین بار دستک دی۔ فوراً کھڑکی کھلی

اور ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں ایک پچاس سالہ ہنس مکھ عورت کھڑی تھی یہی وہ نیک دل مالن تھی۔ قریب ہی ایک اونچے ٹیلے پر شاندار باغ تھا۔ اس باغ کو آسمانی باغ کہتے تھے اور دروازہ بھی آسمانی دروازے کے نام سے موسوم تھا۔

مجھے اس مالن کے سپرد کیا گیا۔ مالن بڑی رحمدل اور متواضع تھی۔ اس نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ یہ عورت پھول پودوں کی معلومات میں ماہر تھی۔ باغ کو اس نے رشکِ جنّت بنا رکھا تھا۔ میرے آنے سے اُسے بڑی سہولت ہوگئی۔ میں ہر کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

اسی طرح بہت دن گزر گئے لیکن گوہر باغ میں نہ آئی۔ تو میں نے مالن سے اس کی بابت پوچھا۔ وہ کہنے لگی۔

"اب وہ باغ میں بہت کم آتی ہے۔ کیونکہ ابھی چھ ماہ ہوئے ہیں ایک رات وہ یکایک محل سے غائب ہوگئی تھی اور بڑی مشکلوں سے ایک ہفتہ کے بعد دستیاب ہوئی۔ تب سے اس کا باپ اس کو کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔"

قریباً ایک ماہ بعد ایک دن میں نے مالن سے سُنا کہ گوہر آج باغ میں آئیگی میرے دل کی کلی کھل گئی۔ میں نے خوش رنگ تیتریاں اور خوبصورت پھول اس کی خاطر جمع کئے۔ خدا خدا کر کے وہ پری بصد شانِ دلبری جلوہ آرا ہوئی۔ وہ اس وقت طاؤسی رنگ کا لباس پہنے تھی۔ چلتے وقت اس کا لباس ہوا میں اُڑتا

اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی جنگلی مورنی اپنے حسین پروں کو پھیلائے رقص کر رہی ہو۔ میں دل پر ہاتھ رکھے اس کے استقبال کو بڑھا مگر فوراً ہی میری سب خوشیاں پائمال ہو کر رہ گئیں۔ اس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ وہ اس بے اعتنائی سے گذر گئی گویا کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔

میں اس کا یہ رویہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اتنے عرصہ میں اس کی فطرت بدل چکی تھی۔ جتنی یہ کبھی متین تھی اتنی ہی شوخ و شنگ۔ جتنی کبھی غمگین تھی اتنی ہی خوش۔ اور جتنی کبھی نستعلیق تھی اتنی ہی اب شریر نظر آئی۔ اس لڑکی کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس کی طبیعت میں سکون نام کو نہ تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل بجھ گیا۔

گوہر کی واپسی پر میں اپنے بستر میں آکر لیٹ گیا۔ افسردگی سے مجھے تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ مالن میری آزردگی کو بھانپتے ہوئے کہنے لگی۔

"بچے تم بیکار اس کا دھیان لگائے بیٹھے ہو یہ تمہارے کام کی نہیں۔ بہتر ہے کہ تم اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ جس چیز کے لئے تم یہ سب مصیبتیں اٹھا رہے ہو اسے آج تک کوئی حاصل نہ کر سکا۔ تم سے پیشتر کئی لوگ اس کی خاطر اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔ میری زندگی سے ہی سبق حاصل کرو ہمیں یہاں آئے ستائیس سال گذر گئے ہیں۔ ہمارا وطن یو۔پی ہے۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ میرے

بھائی کا نام اکبر تھا۔ اس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی چنانچہ ایک نامعلوم روائتی چیز کی تلاش میں وہ یہاں آیا اور اس باغ کا مالی بن کر کئی سال تک اس چیز کی خفیہ طور پر تلاش کرتا رہا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر یکایک وہ ایک دن کہیں غائب ہو گیا اور میں بے کسی کی حالت میں یہاں اکیلی رہ گئی۔ خدا بھلا کرے سیّد نادر شاہ کا جو خانقاہ کے سجّادہ نشین ہیں۔ انہوں نے مجھے پناہ دی۔ پھر ایک سال بعد جب رستم یہاں کا نائب بنا تو اس نے کسی سے میری مصیبت کا حال سُنا اور ترس کھا کر مجھے پھر اس باغ کی نگہداشت پر مامور کر دیا۔ اُن دنوں سے اب تک جلا وطنی کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اگر رستم میری ہمدردی نہ کرتا تو خدا جانے میرا کیا حال ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "رستم کیسا آدمی ہے کیا میں اس سے مل سکتا ہوں"۔

مالن نے کہا "میں نے اُسے دیکھا تو نہیں مگر اس کے حُسنِ سلوک سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت اچھا آدمی ہے"۔

میں نے تعجب سے کہا۔ "اتنی مدّت یہاں رہتے ہوئے کبھی تم نے رستم کو نہیں دیکھا"۔

مالن نے کہا "جب سے میں یہاں آئی ہوں اس نے ایک بار بھی آکر اس باغ کا معائنہ نہیں کیا۔ پھر میں اسے کیسے دیکھ سکتی تھی"۔

میں نے کہا۔ "ماں خدا را مجھے بتاؤ۔ وہ کون سی چیز ہے جس کے حصول کی

خاطر لوگ اپنی جانیں گنواتے چلے آئے ہیں"۔

مالن نے پُرمعنی نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا۔ گویا میرے دل کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ پھر ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

اس واقعہ کے بعد لازمی تھا کہ میں بددل ہو کر لوٹ آتا کیونکہ میں نے اس معاملہ کو جتنا کریدا اتنی ہی پیچیدگیاں بڑھتی گئیں۔ مگر مجھے اب اس معاملہ میں دلچسپی ہونے لگی میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس روائتی چیز کا راز کھول کر چلین لونگا۔

۵

رجب کا مہینہ تھا۔ گونگا سردار غنی کاروبار کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گیا ہؤا تھا۔ قلعہ میں صرف گوہر اور رستم ہی تھے۔ انہی دنوں سامنے والی پہاڑی پہ خانقاہ میں کسی تقریب کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گرد و نواح سے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ مالن کی زبانی معلوم ہؤا کہ خانقاہ میں عرس ہونیوالا ہے۔ ساتویں رجب کو جس دن عرس کی دھوم دھام تھی۔ چاندنی باغ کے پھاٹک پہ رستم اور زائرین میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ زائرین نے باغ پر ہلہ بول دیا۔ رستم مقابلے میں کمزور تھا۔ چونکہ زیادتی صریحاً زائرین کی تھی اس لئے ڈاکٹر پال نے بھی رستم کی حمایت کی۔ زائرین نہتے تھے اور رستم کے آدمی مسلح لیکن عین وقت

پر رستم کے آدمیوں نے غداری کی۔ وہ ڈاکٹر پال کی دخل اندازی سے بھڑک گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رستم اور ڈاکٹر پال گرفتار کر کے قلعہ چاند بانہ کے ایک برج میں بند کر دیئے گئے اور سردار غنی کے لئے جس نے غیر ملکی لوگوں کو اتنے حقوق دے رکھے تھے ہر طرف ناکہ بندی کر دی گئی اور قلعہ کے سیاہ و سفید کا مالک سیّد نادر بنا دیا گیا۔

اس انقلاب کے کچھ دن بعد میں حسبِ دستور رات کو کھڑکی میں بیٹھا اس عدیم النظیر قلعہ کا اداس نظارہ کر رہا تھا۔ سنسان چاندنی تمام قلعے پر محیط تھی جنگلی جھینگر رات کا مغموم نغمہ گانے میں مصروف تھے۔ دوسرے فصیلوں پر کچھ سائے حرکت کرتے دکھائی دیتے جو فوراً ہی غائب ہو جاتے۔

اچانک میری نظر اس برج پر پڑی جس میں قیدی تھے۔ برج سے رنگ برنگی روشنی نکل رہی تھی۔ میں اس روشنی کو کسی شیطانی طاقت کا مظاہرہ خیال کرتے ہوئے اٹھ آیا اور سو گیا۔

صبح مالن سے معلوم ہوا کہ رات کو ڈاکٹر پال پُراسرار طور پر برج سے فرار ہو گیا۔ اور گوہر بھی لاپتہ ہے۔

گو اب مجھے گوہر کا پہلے کی طرح خیال نہ تھا مگر اس طرح اس کے غائب ہو جانے سے مجھے بہت رنج ہوا۔ گھبرا کر باہر نکلا تو قلعے کے سب دروازے کھلے پڑے تھے۔ اور ایک انبوہِ کثیر ہر طرف پھیل رہا تھا۔ اس واقعہ

سے میں اتنا بددل ہُوا کہ واپسی پر تیار ہو گیا۔ مگر سیّد نادر سے ملے بغیر جانا انسانیت کے خلاف تھا۔ اس لئے میں کئی بار خانقاہ میں اس سے ملنے گیا لیکن ہر بار ایسا اتفاق ہُوا کہ وہ خانقاہ میں موجود نہ ہوتا۔ جس کے انتظار میں مجبوراً مجھے اور ٹھہرنا پڑتا۔

کئی دن بعد ایک رات کو میں کھڑکی میں بیٹھا حسرت آمیز نگاہوں سے محلات کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رات بالکل تاریک تھی۔ ابتدائی راتوں کا ہلال افق کے سیاہ دامنوں میں پناہ گزیں تھا۔ ستارے کثرت سے رقص بے تھرکی کر رہے تھے۔ اس رات اتنے ستارے ٹوٹے کہ مجھے وہم ہو گیا اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ضرور قیامت آجائے گی۔

تمام رات میں نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کے قریب میری آنکھ لگ گئی جب بیدار ہُوا تو میرے قریب ہی مونڈھے پر فاطمہ بیٹھی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ میری حالت کا احساس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"مجھے میں تمہاری دشمن نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔ آج میں تمہیں خبر دینے آئی ہوں کہ سردار غنی گوہر سمیت واپس آگیا ہے اور رستم کو بے عزت کر کے قلعہ سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ اب سیّد نادر چاہتے ہیں کہ تمہیں قلعہ کا نائب بنایا جائے۔"

میں نے کہا۔ "میں سیّد نادرہ کا بہت شکر گزار ہوں مگر چونکہ ان پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں"۔

وہ کہنے لگی۔

وہ پیچیدگیاں ابھی تمہارے سامنے کھولے دیتی ہوں۔ سُنو ہم لوگ ایرانی تھے۔ ہم دو بہنیں تھیں۔ میرا باپ کسی خاص چیز کی تلاش میں یہاں آیا تھا اس وقت سردار غنی نوعمر تھا۔ میرا باپ قابل آدمی تھا۔ وہ چند ہی دنوں میں اس تک رسائی پیدا کر کے قلعہ کا نائب بن گیا اور خفیہ خفیہ اس چیز کی تلاش میں مصروف رہا تاہم اسے کامیابی نہ ہوئی۔

"میری بڑی بہن بہت حسین تھی۔ سردار غنی کو اس سے محبت ہو گئی اور میرے باپ نے اس خیال سے کہ شاید قرابت داری کی وجہ سے وہ چیز حاصل ہو سکے، میری بہن غنی سے بیاہ دی۔ کوئی سال بھر کے بعد رستم بھی اسی چیز کی تلاش میں یہاں آیا۔ میرے باپ کو اس کا یہاں آنا بہت ناگوار گزرا مگر رستم چال باز آدمی تھا۔ اس نے چاپلوسیوں سے میرے باپ کو رام کر لیا اور دوست بنکر اُسے زہر دے دیا۔ پھر اپنی مکاریوں سے اُس کی جگہ حاصل کر لی۔

"دوسرے سال یہ انگریز ڈاکٹر بھی کہیں سے آدھمکا۔ یہ بھی اسی چیز کی تلاش میں تھا۔ یہ چونکہ دانا اور موقع شناس تھا۔ لہٰذا اس نے رستم کو دشمن بنانا مناسب نہ سمجھا اور زہر کے تجربات کا ڈھونگ رچا کر چاندنی باغ میں تجربہ گاہ بنا لی

کی اجازت حاصل کر لی۔

"چند سال بعد میری بہن کے گھر گوہر پیدا ہوئی۔ میں اس وقت پوری جوان تھی۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے مجھے ورغلا کر گناہ کے راستے پر ڈال دیا۔ عشق اور مشک بھلا چھپائے کب چھپتے ہیں۔ میری بہن کو کچھ شک ہو گیا اور اس نے میری نگرانی شروع کر دی۔

"میں نے ایک دن ڈاکٹر سے ذکر کیا جس پر اس نے مجھے ایک عرق دے کر ہدائت کی کہ ہر رات اپنی بہن کو سوتے وقت اس عرق کا ایک قطرہ پلا دیا کروں۔ جس سے وہ رات کو بے خبر سو جایا کرے گی۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اسی صبح کو میری بہن اپنے بستر پر مردہ پائی گئی۔ مجھے ڈاکٹر کے عرق پر شک گزرا۔ لیکن اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس کی موت کسی اور وجہ سے ہوئی ہے۔

"میں اس وقت عشق میں اندھی ہو رہی تھی۔ حقیقت جاننے کے باوجود اس کی باتوں پر ایمان لے آئی اور اس کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی۔ حتیٰ کہ سال کے آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ بظاہر تو وہ بہت خوش ہوا مگر دراصل یہ خبر اسے بہت ناگوار گزری۔ اس رات اس نے مجھے سانپ کے زہر کا انجکشن کر کے ایک غار میں پھینک دیا۔

"یہ غار کچھ زیادہ گہرا نہ تھا اور زندگی کے دن بھی باقی تھے۔ خانقاہ والوں

میں سے کوئی مجھے نیم مردہ حالت میں وہاں سے اُٹھا لایا۔ اس نے سفید رنگ کا ایک خوشبودار پر جو سانپ کے زہر کا تریاق تھا، گھول کر مجھے پلایا۔ اس سے میری جان تو بچ گئی لیکن یہ زہر ایسا سخت تھا کہ ہمیشہ کے لئے میرا رنگ سیاہ اور صورت مسخ ہو گئی۔

"خانقاہ والوں کے پاس ایک عرصہ تک میں صاحبِ فراش رہی۔ وہیں میرے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بالکل گوہر کی ہمشکل تھی۔ اس لڑکی کا نام میں نے مہر رکھا اور اس کو سیّد نادر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود ایک حبشی عورت کا بھیس بدل کر ڈاکٹر کی ملازمت اختیار کر لی۔

"سانپ کے زہر کا تریاق یعنی وہ خوشبودار سفید پَر جو مجھے خانقاہ والوں سے ملا تھا میرے پاس موجود تھا۔ اس لئے اس کی مہک سے سانپ میرے گرویدہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر کے پاس میری ملازمت کی غرض و غایت موقع پا کر انتقام لینا تھی۔ لہٰذا میں نے دن رات کی محنتِ شاقہ سے اس پر اپنا اعتبار جما لیا۔

"میری ملازمت کے دوران میں کئی آدمی اس چیز کی تلاش میں آئے جس کی خاطر میرے باپ نے جان گنوائی تھی۔ ڈاکٹر مختلف طریق سے انہیں زہر دے کر مارنے کی کوشش کرتا۔ میں بظاہر ان سے بہت بُرا سلوک کرتی مگر رات کو کسی نہ کسی طرح ان کے پینے کے پانی میں تریاق گھول دیا کرتی سوائے ایک آدمی کے جو اپنی نالائقی کی وجہ سے جان کھو بیٹھا تھا، میں نے سب

کی جانیں بچائیں۔ چنانچہ جب تم یہاں آئے تو مجھے اندیشہ تھا کہ تمہیں ہلاک نہ کر دیا جائے۔ اس لئے میں نے رات کو تمہارے کمرے میں گھس کر تمہارے پانی میں بھی تریاق گھولا۔

"اس ملازمت کے دوران میں مجھے ایک اور راز بھی معلوم ہؤا۔ یعنی ڈاکٹر اور رستم کے درمیان ایک خاص معاہدہ ہو چکا ہے جس کی رو سے غنی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ڈاکٹر رستم کی مدد کرے گا اور اس کے صلہ میں گوہر ڈاکٹر کے حوالہ کر دی جائے گی۔

"اب اس معاہدہ کو عملی صورت دینے میں کئی مشکلات درپیش تھیں۔ وہ قلعہ اور خانقاہ والوں کو اُلّو بنا کر یہ کام سرانجام دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا چند سال کی سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر ایک ایسا شخص حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جو غنی کا ہمشکل تھا۔ وہ خفیہ طور پر یہاں لایا گیا پھر اصل غنی کو زہر سے ہلاک کر کے بہت دُور ایک دلدل میں پھینک دیا اور جعلی غنی کو اُس کی جگہ مقیم کر دیا گیا۔

"میں چونکہ اس راز سے واقف ہو چکی تھی اس لئے خانقاہ والوں کو میں نے فوراً اطلاع دے دی۔ ہماری جماعت کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو تھا ہی نہیں کہ وہ ڈاکٹر وغیرہ کا کچھ بگاڑ سکتی اور نہ ہی کُھلّم کُھلّا چھیڑ چھاڑ کا موقع تھا۔ اس لئے ہماری جماعت خفیہ طور پر ہی غنی کو دلدل سے نکال لائی جو مانچکے

زہر کا تریاق پاکر بچ گیا۔

"اس کے بعد نیا شگوفہ کھلا یعنی جعلی غنی گوہر پہ عاشق ہو گیا۔ گوہر جو ان سازشوں سے قطعاً لاعلم تھی، باپ کی شرمناک حرکات سے آگاہ ہو کر بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر اور رستم کو جو اس بیماری کی وجہ سے لاعلم تھے، سخت فکر لاحق ہوا اور جعلی غنی کی رائے کے مطابق اس کو تبدیلی آب و ہوا کے لئے بمبئی لے جانا قرار پایا۔ رستم اور جعلی غنی دونوں اس کے ساتھ گئے۔

"وہاں جاکر جعلی غنی نے گوہر کو کئی طریقوں سے پھانسنے کی کوشش کی تاہم اس نے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے کو اس ظلم سے بچائے رکھا اور اس صدمہ سے اسکی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس لئے وہ اسے واپس لانے پر مجبور ہو گئے۔

'واپسی کے بعد ایک دن میں نے گوہر کو دیکھا تو وہ مخبوط الحواس ہو رہی تھی۔ مجھے شک سا پیدا ہوا جس کا اظہار میں نے خانقاہ والوں سے کیا۔ اس پر ہماری خفیہ جماعت نیند کی حالت میں اس کو محل سے اٹھا کر ایک محفوظ مقام پہ لے گئی۔

"صبح گوہر کو غائب پاکر ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ڈاکٹر اور رستم کو شک گذرا کہ شاید جعلی غنی کی شخصیت سے آگاہ ہو کر وہ کہیں فرار ہو گئی ہے انہوں نے بڑے زور و شور سے اس کی تلاش شروع کی۔

"ادھر ڈاکٹر کی لڑکی نے بچہ میرے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور جس نے

تہ خانوں میں پرورش پائی تھی، جوان ہو کر میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ سخت بدچلن ثابت ہوئی۔ اس کی حرکات نے مجھے اس سے سخت متنفر کر دیا۔

"چنانچہ جب ہم گوہر کو خانقاہ میں لائے تو قمر نے جو گوہر سے صرف ایک سال چھوٹی تھی، اس کو دیکھا اور اپنا ہمشکل پایا تو اُسے ایک انوکھی چال سوجھی۔ ایک رات وہ قلعے میں جا گھسی اور گونگی بن کر اس نے گوہر کی جگہ حاصل کر لی۔ چونکہ یہ لوگ قمر کے وجود سے لاعلم تھے انہیں اس پر کیسے شبہ ہو سکتا تھا۔ وہ اُسے پا کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن اس نئی افتاد سے مجھے سخت صدمہ ہُوا۔ میں کئی بار خفیہ طور پر قمر سے ملی اور اُسے سمجھایا کہ واپس لے جانا چاہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی بلکہ مجھے دھمکی دی کہ اگر اُسے پھر دق کروں گی تو وہ رستم وغیرہ کو ہماری خفیہ جماعت اور مقامات کا پتہ بتا دے گی۔

اس کا یہ جواب پا کر میں اس سے مایوس ہو گئی۔ تاہم ہماری جماعت کا خیال تھا کہ عین موقعہ پر قمر کو بدمعاشوں کے چنگل سے بچا لیا جائے۔ بغرضیکہ وہ سات آٹھ ماہ تک جعلی غنی کے ساتھ خوب رنگ رلیاں مناتی رہی حتیٰ کہ وہ وقت قریب آ گیا کہ جب ڈاکو کو گوہر کی ضرورت تھی۔ لہذا اس نے جعلی غنی کو احتیاطاً باہر بھیج دیا تاکہ بوقتِ ضرورت باہر سے اسکی امداد کر سکے۔

"جوں جوں وقت قریب آتا گیا، ہماری جماعت کی اُلجھن بڑھتی گئی آخر کار عرس کے موقعہ پر زائرین کی مدد سے اس نے بھلوں پر جھگڑا اٹھا کر ان لوگوں

کو قید کر لیا لیکن جعلی غنی کی مدد سے ڈاکٹر قید سے نکل بھاگا اور سب کی آنکھوں میں خاک جھونک کر مہر کو بھی اڑا لے گیا۔

"ان لوگوں کی فراری کے بعد بھی ہم نے کئی دن تک اصلی غنی اور گوہر کو مصلحتاً چھپائے رکھا لیکن آج کی رات کیونکہ خطرہ بالکل ختم ہو چکا ہے، اس لئے قلعہ کے اصلی مالک دوبارہ محل میں لائے گئے ہیں اور سیّد نادر کی خواہش ہے کہ تم قلعہ کے نائب بنو۔"

۶

قلعے کا نائب بنے مجھے عرصہ ہو گیا۔ گوہر ایک حد تک میری دوست بن گئی تھی لیکن اس کی ہم نشینی سے مجھے سکونِ قلب حاصل نہ ہو سکا بلکہ روز بروز اضطراب بڑھتا گیا۔

اس کا اچھوتا جوبن اور رنگیلا شباب میرے قلب کی گہرائیوں میں سما رہا تھا اور اس کا ساحرانہ حسن ایک مقناطیسی اثر سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ ایک گونگی لڑکی کو محبت سے آشنا کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اپنے شوق کا اظہار نہ کر سکتا تھا اس لئے میری محبت بھی ایک گونگی محبت تھی۔

آخر کار ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے سیّد نادر سے اس کے متعلق عرض کی۔ اس نے کہا "ایک ہفتہ تک جواب دیا جائے گا۔"

ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے اس خفیہ مقام پر لے گیا جہاں ایک دفعہ پہلے بھی مقدس ضعیفہ سے مل چکا تھا وہ ضعیفہ بدستور شیر کی کھال پر براجمان تھی۔ مگر اب بجائے سیاہ چادر کے سفید چمکیلے پروں کے لباس میں ملبوس تھی۔ اس کا پاکیزہ زرد چہرا ملکوتی جاہ و جلال کا مظہر تھا۔

میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ سفید سایہ جو ایک دفعہ میں نے صحرا میں دیکھا تھا یہی مقدس وجود تھا۔ میں فوراً آداب بجالایا جس کے جواب میں چند دعائیہ الفاظ کہے گئے۔ میں نے ضعیفہ سے بھی اپنے دلی ارادے کا اظہار کیا۔ ضعیفہ نے کہا۔

"اب تو گوہر کسی کے کام نہیں آسکتی۔ وہ موقع گزر چکا ہے جبکہ وہ کارآمد ہو سکتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "مقدس ماں میں پہلے بھی ایک دفعہ عرض کر چکا ہوں اور اب پھر التجا کرتا ہوں کہ میری طرف سے سب شکوک رفع کر دیجئے۔ میں گوہر کو صرف محبت کی خاطر حاصل کرنا چاہتا ہوں مجھے دوسری کوئی غرض نہیں۔"

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ مِل کے پیچھے اندھے غار میں سے ایک پُرزور اور ہولناک چیخ سنائی دی اور ساتھ ہی کسی چیز کے گرنے کا دھماکہ ہُوا۔ ہم سب گھبرا

کر اُدھر دیکھنے لگے۔ یکدم ضعیفہ کے قریب ہی ایک چور دروازہ کھلا اور بوڑھی مالن چیختی چلاتی اندر داخل ہوئی۔ وہ ضعیفہ کے قدموں پر گر کر کہنے لگی۔

"آہ میرا گم شدہ بھائی جو پچیس سال بعد ملا تھا پھر مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہ کسی صدمہ سے پاگل ہو رہا تھا اور اسی دیوانگی میں غار کے اندر کود گیا۔ خدا کے لئے اُسے بچایئے"۔

سیّد نادر نے فوراً غار کے منہ سے سِل ہٹائی تو غار کے کسی بالائی سرے پر سے ایک کمند غار میں لٹکتی دکھائی دی۔

مالن کی حالتِ زار پر مجھے بہت رحم آیا اور میں غار میں اترنے پر آمادہ ہو گیا مگر ضعیفہ مجھے روک کر کہنے لگی۔

تم اس میں نہیں جا سکتے، نیچے ہوا زہریلی ہے۔ وہاں کوئی جان دار زندہ نہیں رہ سکتا۔ مالن کا بھائی بھی جو لالچ سے اندھا ہو کر نیچے اُتر رہا تھا۔ زہریلی ہوا کے اثر ہی سے بے ہوش ہو کر گرا ہے"۔

مالن نے تڑپتے ہوئے کہا۔ "پھر اب میرے بھائی کا کیا ہوگا"۔

ضعیفہ نے کہا۔ "یہ کام مجھے کرنا ہوگا۔

الغرض ضعیفہ کے کہنے پر میں اور مالن چور دروازے سے باہر کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ایک کمرے میں چلے گئے۔ البتہ سیّد نادر ضعیفہ کے پاس ہی رہا۔ اس کمرے کے کونے میں ایک قبر تھی۔ مالن نے مجھے بتایا کہ یہ سردار چاند باز

کا مقبرہ ہے۔ میں نے دیکھا تو قبر کا تعویذ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس کے نیچے ایک گہرا غار تھا۔ دراصل یہی تعویذ اس اندھے غار کا بالائی سرا تھا جس میں کمند لٹک رہی تھی۔

ہم دونوں نہایت اضطراب کی حالت میں وہاں بیٹھے رہے۔ کافی وقفہ کے بعد سیّد نادر آکر پھر ہمیں ضعیف کے پاس لے گیا۔ کمرے میں مالن کے بھائی کی لاش پڑی تھی۔ سیّد نادر نے کہا۔

"افسوس تمہارا بھائی یا قلعہ کا سابق نائب رستم ختم ہو چکا ہے۔"

مالن اس انکشاف پر پہلے تو بہت حیران ہوئی پھر بھائی کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔ یک لخت مالن کے منہ سے ایک بے تحاشا چیخ نکلی اور وہ بھاگ کر کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ میں نے گھبرا کر رستم کی لاش کی طرف دیکھا یکایک میری نظر ایک عجیب چیز پر پڑی جو رستم کے پاؤں کے قریب ہی پڑی تھی۔

شدّتِ خوف سے میرے بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ میں نے عمر بھر میں اتنی خوفناک چیز کبھی نہ دیکھی تھی۔ یہ کوئی ڈراؤنی شکل کا آبی جانور تھا یا کوئی پرانے زمانے کا عفریت۔ ہماری بدحواسی پر ضعیف نے افسوسناک لہجہ میں کہا۔

"ڈرو مت۔ یہ بدنصیب بھی کبھی بانکا جوان تھا اسکی حالت سے تمہیں عبرت حاصل کرنا چاہیئے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ سید نادر نے بھی اس کی تقلید کی۔
ان کی دیکھا دیکھی ایں بھی ہمت کر کے آگے بڑھا۔ یہ ایک عجیب و غریب انسان تھا مگر اتنا خوفناک اور بھیانک کہ کوئی اُسے انسان کہنے کے لئے تیار نہ تھا۔
اس کی ٹانگیں اور بازو سڑ گل کر جھڑ چکے تھے۔ چھاتی اور پسلیاں آہنی سپرنگ کی طرح تھیں جس پر چمڑے کی باریک جھلی چڑھی ہو اور گردن ایک بوتل کی مانند تھی جس پر بڑی سی بے ہنگم کھوپڑی لگی تھی۔ چہرے کا نچلا حصہ سکڑ کر اخروٹ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ناک۔ کان اور دانت ندارد تھے۔ چہرے پر صرف آنکھیں ہی آنکھیں تھیں جو کھلی ہوئی نہایت خوفناک اور بے ڈول دکھائی دیتی تھیں۔
وہ بے ہوشی کی حالت میں بار بار منہ کھولتا تھا۔ ضعیفہ نے کہا۔
"یہ بھوکا ہے اسے غذا کی ضرورت ہے"۔ اس پر مالن جا کر کہیں سے دودھ لائی جو ایک سیپ سے ذرا ذرا اس کے منہ میں ٹپکایا گیا۔ لیکن اس کی زبان سوکھ کر تالو سے چمٹ چکی تھی۔ اس لئے بڑی کوششوں سے دودھ اس کے گلے سے اُترا۔ گو اُسے غوطے پہ غوطہ آ رہا تھا تاہم وہ دودھ پیتا گیا حتیٰ کہ وہ تھک کر بے ہوش ہو گیا یا سو گیا اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر ہوش سنبھالا اور کرب و بے چینی سے ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔
اسکی انتہائی اذیت اور تلملاہٹ ناقابل برداشت تھی۔ رنج و ملال سے ضعیفہ اس کے پاس دو زانو بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔ عین اسی وقت اسے اُبکائی

ہوئی۔ اس نے ایک خوفناک آواز کے ساتھ قے کی اور یکایک اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

رنج و ملال سے ضعیفہ کے اشک جاری ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ اس بھوت کے لئے اسے اتنا ملال کیوں ہوا۔ اچانک میری نظر اس قے پر جا پڑی۔ تو اس میں ایک عجیب چیز دکھائی دی۔ میں اس چیز کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے آگے بڑھا مگر ضعیفہ نے فوراً اس چیز کو شیر کی کھال سے ڈھانپ لیا۔

بعد ازاں میں اور واں دونوں ضعیفہ کے حکم سے چلے آئے۔ اس واقعہ کے دوسرے دن سید نادر نے بھی دربار میں بلا بھیجا اور سردار غنی نے گوہر کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔ شادی کے بعد میرا تمام وقت گوہر کی دلجوئی اور اس کے حسنِ دلکش کے مطالعہ میں گزرنے لگا۔ میں ہر روز اس کو سیر کی خاطر قلعہ سے باہر لے جاتا۔ ایک دن اتفاقاً ہم لوگ چاندنی باغ کی طرف جا نکلے۔

اس وقت مجھے ڈاکٹر کے سانپ یاد آ گئے اور میں گوہر سمیت تجربہ گاہ کی طرف ہو لیا۔ جب ہم تجربہ گاہ میں داخل ہوئے تو اس وقت فاطمہ ایک عجیب و غریب سانپ کا سر کسی اوزار سے پکڑ کر اس کی تھیلیوں سے زہر نکال رہی تھی۔ یہ سانپ نہایت خوبصورت اور موٹا تازہ تھا۔ اس کی سفید اور چمکیلی جلد روغن شدہ معلوم ہوتی تھی۔

فاطمہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھی کہ اسے ہمارے آنے کی خبر تک نہ

ہوئی۔ لیکن جونہی گوہر کی نظر اس سانپ پر پڑی، گھبراہٹ میں بے تحاشہ ایک چیخ اُس کے منہ سے نکلی جس سے فاطمہ یک دم دہل گئی اور بوکھلاہٹ میں اوزار اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

سانپ جو غضب ناک ہو رہا تھا، فاطمہ کی گرفت سے نکلتے ہی پوری طاقت سے گوہر پر حملہ آور ہوا جو افراتفری میں ایک پنجرے سے اُلجھ کر سانپ کے قریب گر گئی تھی۔ سانپ اس کے ارد گرد اس طرح لپٹ گیا جیسے شاخِ صندل سے خشک بیل۔

اس اچانک حادثے سے ہم ایسے حواس باختہ ہوئے کہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی اور بے بسی کے عالم میں اس ہولناک نظارے کو دیکھا کئے۔ حتیٰ کہ وہ خونخوار سانپ خود ہی اس سے علیحدہ ہو کر کہیں بھاگ گیا۔

بے ہوش گوہر کو اسی دم قلعہ میں پہنچایا گیا۔ اس کا تمام جسم سانپ نے اپنے نوکیلے دانتوں سے چھید ڈالا تھا اور بدن پر بڑے بڑے سیاہ آبلے اُبھر آئے تھے۔ فاطمہ نے اپنے تمام تجربات اس پر ختم کر دیئے مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ وہ مسلسل تین دن بے جان پڑی رہی۔ کوئی تریاق اس پر اثر نہ کرتا تھا۔ اس کی حالت سخت مخدوش تھی۔

آخر تیسرے دن خدا خدا کر کے اسکی حالت نے پلٹا کھایا۔ اس کے آبلے خشک ہوئے اور متورم جسم ہلکا ہلکا نظر آنے لگا۔ اس نے پکپکا کر آنکھیں کھولیں

اللہ بچاؤ بچاؤ کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔

گوہر کی زبان سے یہ الفاظ سُنکر سب اچھل پڑے۔ میری مسرّت کا تو ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کا بولنا معجزہ سے کم نہ تھا۔ میں اس سانپ کے زہر کو تائید غیبی خیال کرنے لگا۔ خدا نے میری سُن لی۔ وہ صحت یاب ہونے کے علاوہ قوتِ گویائی بھی حاصل کر چکی تھی۔!

گوہر کی صحت یابی کے بعد مجھے خیال پیدا ہُوا کہ اس سانپ کے زہر سے ضرور غنی کا گونگا پن بھی دُور ہو سکتا ہے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ سانپ بھاگ چکا تھا۔ لیکن فاطمہ سے میں نے اظہارِ خیال کیا تو معلوم ہُوا کہ اس کے پاس وہ زہر موجود ہے جو اس دن سانپ کی کچلیوں سے نکال کر اس نے ایک شیشی میں جمع کر لیا تھا۔ اب انجکشن کے لئے کسی ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ لیکن فاطمہ نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس نے بتایا کہ وہ انجکشن بھی کر سکتی ہے۔

چنانچہ غنی کا علاج شروع ہو گیا۔ وہ انجکشن سے بہت ڈرتا تھا لیکن میرے اصرار پر مجبور ہو گیا۔ میری امید کے مطابق علاج کارگر ہُوا۔ چنانچہ چند دن میں غنی کا گونگا پن بھی دُور ہو گیا اور قلعہ میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔

۷

نحوست کے بادل چھٹ چکے تھے۔ خوش بختی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا

قلعہ میں خیر و برکت کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف شادمانی کا تسلط تھا۔ ایک دن سید نادر صبح خود میرے پاس آئے کیونکہ مجھے اس مقدس ضعیفہ نے بلایا تھا۔ آج میری آنکھوں پر پٹی نہ تھی۔ ہم چاند باز کے مقبرے سے گزرتے ہوئے تہ خانہ میں پہنچے۔

مقدس ضعیفہ شیر کی کھال میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بہت نحیف و کمزور ہو رہی تھی۔ اس نے نہایت شفقت سے مجھے پاس بٹھایا۔ اور کہنے لگی۔

"میرے بچے" میں نے بہت طویل عرصہ اس نجس دنیا میں گزارا ہے۔ اب دنیا کے بکھیڑوں اور کاہشوں سے تھک گئی ہوں اور کشمکش حیات سے تنگ آکر اس سیاہ کار دنیا کو جلد از جلد چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ تمہیں ایک وصیّت کروں کیونکہ میں اچھی طرح سے آزما چکی ہوں کہ تم نیک نیت اور راستباز آدمی ہو۔ مگر اس وصیّت سے پہلے اپنی داستانِ حیات سنا کر ایک عجیب انکشاف کرونگی۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آج سے آٹھ صدیاں پیشتر خانقاہ والی پہاڑی پر ایک قصبہ آباد تھا اور میرا باپ سردار مراد وہاں کا حاکم تھا۔"

حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔

"آج سے آٹھ صدیاں پیشتر" میں نے دوہراتے ہوئے بے اعتباری سے

کہا۔ "یعنی آپ کی عمر آٹھ سو سال ہے"۔

"ہاں آٹھ سو سال"۔ ضعیفہ نے متانت سے کہا۔ "ہم دو بہن بھائی تھے میرا نام سارہ تھا اور میرے بھائی کا نام چاند باز۔ میرا بھائی جوان ہو کر سخت ظالم نکلا۔ وہ انسان نہیں بلکہ درندہ تھا۔ انسانی خون بہانا اس کے نزدیک کھیل تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ڈاکہ مار کر قافلوں کو لوٹنے لگا۔

"انہی دنوں دو نوجوان اس علاقہ میں وارد ہوئے۔ یہ دونوں سگے بھائی تھے اور قوم کے سیّد۔ وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہاں ان دونوں جوانوں کی بہت قدر و منزلت ہوئی۔ تمام علاقہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حتیٰ کہ میرا باپ بھی اپنے قبیلہ سمیت مسلمان ہو گیا۔ مگر میرا بھائی بدستور کافر رہ کر خلقِ خدا کو دُکھ دیتا رہا۔

"میرا باپ اپنے بیٹے سے سخت نالاں تھا۔ اس نے ان سیدوں میں سے ایک کے ساتھ جس کا نام سیّد باقر تھا، میرا نکاح کر کے اسے اپنی زندگی ہی میں اس قصبے کا حاکم بنا دیا۔ میرے بھائی کو باپ کے اس سلوک سے بہت رنج ہوا مگر سیّد باقر کا اقتدار بہت تھا اس لئے اس کی کچھ پیش نہ چلی اور وہ اپنا وطن چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

"چند سال بعد جب میرا باپ فوت ہو گیا تو میرا بھائی پھر وطن واپس آیا۔ اور نہایت محبت و خلوص سے مجھے ملا۔ اس کے ساتھ ایک منجم بھی تھا جس نے

پیشنگوئی کی کہ نوروز کے دن ایک خاص ساعت میں میرے ایک لڑکی پیدا ہوگی۔

"جب نوروز آیا تو منجم نے اس خاص ساعت کی پہچان کے لئے ایک ناند میں پانی بھر کر دو سیب اس میں ڈال دیئے۔ جب وہ خاص ساعت آئی تو ناند میں پڑے ہوئے دونوں سیب خود بخود ایک دوسرے سے مل گئے اور سچ مچ عین اسی ساعت میں وہ لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا نام ہزارہ رکھا گیا۔

"ہزارہ کی پیدائش سے سب کو خوشی ہوئی مگر میرے بھائی کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ بڑے ناز و نعم سے یہ لڑکی پرورش پاتی رہی۔ جب میری بچی نے اٹھارویں سال میں قدم رکھا تو وہ منجم پھر یہاں آیا اور اس نے سیّد باقر کو اکسایا کہ اس کے وطن میں کفر و شرک کا بہت زور ہے اور وہاں تبلیغ اسلام کی سخت ضرورت ہے۔

"سیّد باقر جو تبلیغ کا شیدا تھا اس کے چکمے میں آگیا۔ اس نے گھر بار اپنے چھوٹے بھائی سیّد الیاس کو سونپا اور خود ہم دونوں ماں بیٹی کو ہمراہ لے کر یہاں سے روانہ ہوگیا۔

"میرا بھائی اور منجم بھی ہمراہ تھے۔ ہم مسلسل دو ماہ کے سفر کے بعد پانگی کے ان پہاڑوں میں پہنچے جہاں ہیرے کی کانیں تھیں۔ ان پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ و تاریک وادی تھی جس پر ہر وقت کہر چھائی رہتی تھی۔ اس وادی میں

پرتن نامی ایک گاؤں آباد تھا۔ یہاں کے لوگ مار پرست تھے۔ سامنے والے پہاڑ کی اونچی چوٹی میں سے دھواں نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس پہاڑ پہ ایک مندر تھا جس کو ناگ دیوتا کا مندر کہتے تھے۔

وہ منجّم جس کا نام مانی تھا، اس گاؤں کا باشندہ تھا۔ اس لئے ہم نے اسی گاؤں میں قیام کیا اور سیّد باقر نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مگر کامیابی کی کوئی امید دکھائی نہ دی اور تھوڑے دن بعد سیّد باقر رات کو یکایک کہیں غائب ہو گیا۔ انتہائی تلاش کے بعد بھی اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

"سیّد باقر کی گمشدگی سے ہم دونوں ماں بیٹی کو بہت صدمہ ہوا۔ ہم دن رات مغموم و محزون رہنے لگے اور میں نے بھائی سے واپس چلنے کے لئے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ مگر نہ جانے میرے بھائی کو اس جگہ سے کیا دلچسپی تھی کہ وہ واپسی کا نام تک نہ لیتا تھا۔ بلکہ جب واپسی پہ زور دیتی تو وہ سیّد باقر کو کوسنے لگتا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہمیں پردیس میں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

"اسی طرح دن گزرتے گئے۔ ایک دن جبکہ میرا بھائی مانی منجّم کے ساتھ باہر کہیں بغرض سیر گیا ہوا تھا اور ہم دونوں ماں بیٹی اداس گھر بیٹھی ہوئی تھیں تو ہماری جھونپڑی میں ایک خوبصورت پہاڑی عورت آئی۔ اور کہنے لگی۔

"تم لوگ خطرے میں ہو۔ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مانی اچھا آدمی نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ بھاگنے لگی۔ لیکن میں نے اسے پکڑ لیا اور تسلّی و تشفی دی میرے

حسنِ سلوک سے مطمئن ہو کر اس نے بتایا کہ وہ ایک اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ گاؤں کا مکھیا تھا۔ افواہ تھی کہ اس کے پاس ایک روائتی چیز ہے اور اس کی برکت سے وہ خوشحال ہے۔ چنانچہ دغاباز مانی اس چیز کی جستجو میں اس کے باپ کا دوست بنا اور وہ چیز نہ ملنے پر اس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کے شوہر کے ساتھ دوستی گانٹھی۔ جب وہ بھی اس چیز کے متعلق کچھ نہ بتا سکا تو غصّے میں آ کر اسے بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ چونکہ یہ جرائم مانی نے دوستی کے بھیس میں کیے تھے، اس لئے اُسے مانی پر کچھ شبہ نہ ہوا پھر اُس نے اس پر بھی ڈورے ڈالے اور جب اسے پھانسنے میں کامیاب ہو گیا تو اس سے بھی اس چیز کا پتہ پوچھا۔ چونکہ اس چیز کا اسے خود علم نہ تھا۔ لہٰذا وہ کچھ نہ بتا سکی اس پر وہ چڑ گیا اور ایسے وقت میں جب وہ ایک ناجائز بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے دھتکار دیا۔ اب گاؤں والے اس سے سخت نفرت کرتے۔ اسے اپنے گاؤں میں گھُسنے نہ دیتے۔ وہ اس مفلوک الحالی میں زندگی گزارتی رہی۔

"اس عورت کی باتیں سن کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور دل میں چور بیٹھ گیا کہ کہیں سیّد باقر کو بھی ٹھکانے نہ لگا دیا ہو۔ شام کو جب میرا بھائی گھر واپس آیا تو میں نے اس سے یہ ذکر کیا۔ اس نے جواب دیا۔ سیّد باقر کے پاس کونسی روایتی چیز تھی۔ جس کی خاطر مانی اسے ہلاک کرتا۔ جواب معقول تھا۔ میں خاموش ہو گئی"۔

"اس واقعہ کے سترہ دن بعد جب میں اپنے بستر میں غافل سو رہی تھی۔ کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ جھونپڑی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھی فوراً ہی کسی نے نرم لہجہ میں کہا۔

"بی بی میں وہی ماں کے ہاتھوں تنگ آئی ہوئی عورت ہوں۔ جو اس روز آپ سے ملی تھی"۔

میں نے متعجب ہو کر کہا "تم اس وقت یہاں کیسے آئی ہو"

وہ بولی "یہ باتیں پھر ہوں گی پہلے بتاؤ کہ تمہارا بھائی اور بچی کہاں ہیں"۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کا آسرا لے کر بستر ٹٹولنے شروع کر دیئے۔ لیکن بستر خالی تھے۔ شدّتِ غم سے میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ میں نے اس سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے"۔

وہ جھٹ کہنے لگی "ضرور بتاؤں گی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ اگر ہم وقت پر جا پہنچیں تو شاید وہ لوگ بچ جائیں"۔

"میں فوراً اس کے ساتھ ہو لی۔ رات سخت اندھیری تھی۔ آسمان پہ کثرت سے ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ کھوہوں اور بھٹوں میں سے درندوں کے دھاڑنے کی خوفناک آوازیں آ رہی تھیں۔ پہاڑی راستہ ناہموار تھا۔ ہم ایک پر پیچ پگڈنڈی کے راستے ٹھوکریں کھاتے ناگ دیوتا کے مندر میں داخل ہوئے۔

"مندر میں کسی خاص مصالحہ کی بنی ہوئی بتی جل رہی تھی اور دیوار کے ساتھ بنی ہوئی شہ نشین پر ایک بہت بڑے سانپ کی مورتی رکھی تھی جو کنڈلی مار کر بیٹھا دکھایا گیا تھا۔ اس مورتی کے جسم پر نہ معلوم کیوں چھوٹے چھوٹے گڑھے بنے ہوئے تھے۔ ان کے سہارے وہ پہاڑی عورت پنجوں کے بل مورتی کے سر پر چڑھ کر اس کے کھلے منہ میں جا گھسی جس کی میں نے بھی تقلید کی۔

"اس مورتی کے منہ میں زینہ تھا جس کے ذریعے ہم نیچے کسی تہہ خانے میں اُتر گئیں۔ اس تہہ خانے کے دوسرے سرے پر ایک چوبی دروازہ تھا۔ نہ جانے اس پہاڑی عورت نے کس طرح وہ دروازہ کھولا جس کے ذریعے ہم باہر کھلی ہوا میں پہنچیں۔ یہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم ایک لٹکی ہوئی چٹان کے سرے پر کھڑی تھیں۔

چٹان کے نیچے ایک گہری اور فراخ کھڈ تھی۔ اس کھڈ کے درمیان ایک بلند چٹان تھی جو کھڈ کو دو حصّوں میں منقسم کرتی تھی۔ ایک بڑا تھا اور دوسرا چھوٹا فراخ حصّے میں نشیبی مقام پر ایک عظیم الجثّہ روپہلی سانپ تہہ در تہہ سیم کی طرح کنڈلی مارے پڑا تھا جس کے نتھنوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس سے تھوڑی دُور پرے بلندی پر ایک بہت جسیم اور شاندار مور سرنگوں بیٹھا تھا۔ یہ کھڈ ایک دلپسند خوشبو سے لبریز تھی۔

اسی درمیانی چٹان کے ڈھلوان حصّہ پر ایک مصالحہ کی بتّی جل رہی تھی جس

کے قریب ہی میرا بھائی اور مانی ہزارہ کو لئے کھڑے تھے۔

یہ کھڈ چونکہ ہیرے کے پہاڑوں سے گھری ہوئی تھی اس لئے بتی کی جوت سے تمام کھڈ بقعۂ نور بنی ہوئی تھی اور جس جگہ ہم کھڑی تھیں یہ بھی اسی جگمگاہٹ سے روشن تھی۔

"یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر میں مخبوط الحواس ہو رہی تھی۔ یکایک ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا جس کی روشنی اس انداز سے اس غار میں پڑی گویا وہیں گرے گا۔ عین اسی وقت سانپ اور مور کے جسم متحرک ہوئے انہوں نے کھلے آسمان کی طرف دیکھا اور آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ دونوں کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔

جونہی ان کے آنسو گرے فوراً میرے بھائی نے ہزارہ کو سانپ کے منہ میں دھکیل دیا۔ اس روح فرسا منظر کو دیکھتے ہی میں اندھا دھند کھڈ میں کود گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں اس دھواں دھار کھڈ کے پچھلے چھوٹے حصہ میں پڑی تھی۔ میرا تمام جسم سفید خوشبو دار پردوں میں دھنسا ہوا تھا اور وہی پہاڑی عورت میرے قریب بیٹھی تھی۔ کئی انسانی ڈھانچے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

"وہ بہادر عورت ایک کمند کے ذریعہ مجھے کھڈ سے نکال لائی اور اس نے ٹھیٹ پہاڑی طریقہ سے میرا علاج کیا۔ جس سے کچھ دنوں بعد میرے زخم اچھے

ہو گئے۔ اس پہاڑی عورت نے مجھے ایک عجیب بات بتائی کہ خلائی بادشاہت کے چار مجرم یعنی آدم و حوّا۔ سانپ اور مور جب معتوب کر کے دنیا کے مختلف حصّوں میں پھینکے گئے تو کچھ مدّت کے بعد جس طرح آدم و حوّا کا ایک خاص مقام پر ملاپ ہوا تھا اسی طرح سانپ اور مور بھی اس مقام پر آملے اور اسی زمانے سے یہ دونوں اس بھٹ میں رہتے ہیں۔

مگر ہر صدی کے بعد ایک ایسی رات آتی ہے جس رات وہ زمین پر پھینکے گئے تھے اس رات نظامِ فلکی میں کچھ گڑ بڑ سی مچ جاتی ہے اور کثرت سے ستارے ٹوٹتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب وہ ستارہ ٹوٹتا ہے جس کے ذریعہ یہ زمین پر پھینکے گئے تھے تو اِن دونوں مجرموں کو اپنا اپنا گناہ یاد آجاتا ہے اور ندامت سے دونوں کا ایک ایک آنسو نکلتا ہے۔

سانپ کا آنسو شیطانی اثر کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سانپ بن جاتا ہے اور مور کا آنسو اس کے یادِ الٰہی میں مصروف ہونے کی وجہ سے ایک موتی کی صورت اختیار کر لیتا ہے پھر سانپ کے آنسو سے بنا ہوا سانپ اس موتی کو نگل لیتا ہے چنانچہ پرانے زمانے کی جو روائتیں ہیں کہ سانپ کے منہ میں ایک موتی ہوتا ہے جس کو سانپ کا من کہتے ہیں۔ اسی سانپ کے متعلق ہیں۔

اِس موتی میں یہ خاصیّت ہوتی ہے کہ جو جاندار اسے اپنے منہ میں رکھے وہ موت کی دستبرد سے محفوظ رہتا ہے۔ لہٰذا مائی کو یہ موتی حاصل کرنے کی

زبردست خواہش تھی۔ جوں جوں صدی ختم ہونے لگی وہ اس موتی کیو سطے بے قرار ہوگیا لیکن موتی حاصل کرنا آسان کام نہ تھا کیونکہ غار کے عین دہانے پر سانپ بیٹھا تھا اور انتقام پر مور۔ سانپ کے آگے سے گزر کر موتی تک جانا گویا خود موت کو دعوت دینا تھا۔

مانی نے اس سانپ کو رام کرنے کی کئی تدبیریں کیں لیکن اُسے کامیابی نہ ہو سکی۔ آخرکار اس نے اپنے علم کے ذریعہ سے پتہ لگایا کہ ہر صدی کے بعد ایک خاص ساعت میں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جو اپنے اندر حوّا کے سے اوصاف رکھتی ہے اور اس وقت جبکہ ان کے آنسو نکلیں اس لڑکی کو سانپ کے آگے ڈال کر موتی وہاں سے لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ سانپ حوّا کا دشمنِ ازلی ہے اس لئے وہ اس قربانی سے بہت خوش ہوتا ہے۔ بشرطیکہ لڑکی پاکیزہ اور کنواری ہو۔ لہٰذا اس کام کے لئے مانی نے میری لڑکی کو جو اسی خاص ساعت میں پیدا ہوئی قربانی دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اب جس دن اس نے پہاڑی عورت کو ٹھکرایا تھا وہ اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اور اس نے اس کھڈ کا سراغ لگانے کے علاوہ یہ راز ایک پرانی تحریر سے پا لیا۔ وہ کئی دفعہ اس خفیہ راستہ سے وہاں گئی۔ ایک دن جب وہ کھڈ کے اوپر والی آویزاں چٹان پر کھڑی تھی۔ اتفاقاً پھٹے بادلوں سے سورج چمکا اور اس کا سایہ سیدھا کھڈ میں اس سانپ کے اوپر پڑا اور وہ غضبناک ہو کر پھنکارنے لگا۔

آخر متعدد بار کے تجربے سے اسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ عورت کے سائے سے خائف ہے۔

اس عورت کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اب وہ وقت بالکل قریب ہے جبکہ مانی سانپ کو قربانی دے گا۔ لہٰذا اس نے تہیّہ کر لیا کہ عین قربانی کے وقت سانپ پر اپنا سایہ ڈالے گی اور اس طرح مانی کی موت کا سامان کر کے اپنا انتقام لے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ میری بچّی بچ جائے اس لئے وہ مجھے ساتھ لے آئی لیکن ہم ذرا دیر سے پہنچیں اور قربانی سے قبل وہ اپنا سایہ سانپ پر نہ ڈال سکی۔

جس وقت میری بچّی کو سانپ کے منہ میں دیا گیا تو سانپ خوشی سے جھومنے لگا۔ مانی نے جھٹ سانپ کے آگے سے گزر کر موتی اُٹھا لیا۔ عین اسی وقت وہ عورت بھی کمند کے ذریعہ سے کھڈ میں اتری جب مانی موتی لے کر چٹان پر چڑھنے والا تھا اس نے مانی کو پکڑنا چاہا مگر مانی نے اُسے دھکّا دے کر ایک طرف پھینک دیا۔

یک دم سانپ اس عورت کے سائے سے جھلّا اُٹھا اور آگ کا ایک زبردست شعلہ اس کے منہ سے نکلا جس سے مانی کا جسم جھُلس گیا اس نے میرے بھائی کی طرف مدد کو ہاتھ بڑھایا مگر میرے بھائی نے بجائے مدد کے اس کے ہاتھ سے موتی چھین لیا۔ دوسری مرتبہ سانپ پھر پھنکارا جس سے مانی جل کر

خاک ہو گیا اور میرا بھائی بھی آگ کی لپک سے نہ بچ سکا۔ تاہم وہ موتی لے کر کمند کے سہارے کسی نہ کسی طرح کھڈ سے باہر نکل گیا۔

وہ عورت چونکہ مانی کے دھکے سے مور کے پاؤں کے قریب جا گری تھی اس لئے بچ گئی۔ اگرچہ وہ زندگی سے مایوس ہو چکی تھی کیونکہ سانپ کے سامنے سے زندہ بچ کر نکل جانا ناممکن تھا مگر اُسے ایک نہایت حکیمانہ ترکیب سوجھی۔ یعنی اسے خیال آیا کہ جس مور کا آنسو موت سے بچا سکتا ہے تو اس کے پروں میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ خاصیت ہوگی۔ لہذا اپنے لباس کے اندر بے شمار پر بھر لئے پھر جان پر کھیل کر سانپ کے سامنے سے گزر گئی اور چٹان کو پھاند کر کھڈ کے اس حصہ میں آ گئی جہاں میں بے ہوش پڑی تھی سانپ اُسے اپنے سامنے دیکھ کر برافروختہ تو بہت ہوا مگر اُن پروں کی بدولت وہ ہلاکت سے بچ گئی۔

میں زخموں کی وجہ سے قریب المرگ تھی اس حالت میں وہ نہ جانے کس طرح مجھے باہر نکال لائی اور مور کے پروں سے ڈھانپ دیا۔ اس طرح میری جان بچ گئی۔ صحت یاب ہونے پر میں نے اس سے اپنے بھائی کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ وہاں سے واپس آ کر ایک پہاڑی گڈریے کے گھر زیر علاج رہا۔ وہ اس زہریلی آگ کے اثر سے جو اس کے بدن پر پڑی تھی گونگا ہو چکا تھا۔ کئی دن بعد جب اس کے زخم اچھے ہوئے تو وہ ہیروں کا ایک بھاری خزانہ جو مانی نے میری لڑکی کی قیمت میں اسے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا لیکر

واپس چلا گیا اور اس گڈریے کی خوبصورت لڑکی کو بھی ساتھ بھگا کر لے گیا جس کے ہاں وہ مہمان تھا۔

سیّد باقر کی گمشدگی سے میں پہلے ہی سوگوار رہتی تھی۔ اب لڑکی کی حسرتناک موت سے رہا سہا سہارا بھی ٹوٹ گیا۔ میں زندگی سے بیزار ہو گئی مگر میری محسنہ نے سمجھایا کہ میرا زندہ رہنا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنے بھائی کے ظلم و ستم سے خلقِ خدا کو بچاؤں۔ غرضیکہ اس کے مشورہ پر میں نے ان پروں کا لباس بنا کر پہن لیا اور پوشیدہ طور سے اپنے ملک میں واپس آ گئی اور اپنے دیوار سیّد الیاس کی سرپرستی میں خفیہ طور پر رہنے لگی۔

اس زمانے میں میرے بھائی نے اپنے نام پر قلعہ آباد کیا۔ اس گڈریے کی لڑکی سے میرے بھائی کے ہاں بہت سی اولاد پیدا ہوئی جو سب کی سب اپنے باپ کی طرح گونگی تھی۔ اس نے اپنا اور اپنی اولاد کا گونگا پن دور کرنے کی انتہائی کوششیں کیں۔ حتیٰ کہ تمام علاقہ میں ناگ دیوتا کے نام پر مندر بنوائے اور بُت پرست بن گیا کہ شاید اسی طریقے ناگ دیوتا اس پر خوش ہو کر اپنے زہر کا اثر زائل کر دے اور گونگے پن سے نجات مل جائے۔ لیکن تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

کئی سال بعد ایک اور بلوچی نوجوان جو اپنی لاثانی طاقت کے باعث ایک قبیلے کا سردار مانا گیا تھا اس موتی اور خزانہ کی سُدھ بُدھ پا کر قلعہ پر حملہ آور ہوا

جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے بھائی کے سب بیٹے لڑائی میں مارے گئے اور میرے بھائی کو زندہ قید کر لیا گیا۔ فتح یابی کے بعد اس سردار نے میرے بھائی سے موتی طلب لیا۔ اُسے بڑی بڑی تکلیفیں دی گئیں مگر میرا بھائی برابر لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔

آخر کار نئے سردار نے دق ہو کر میرے بھائی کو اس اندھے غار میں پھینک دیا جس پر اس کے نام کا مقبرہ بنوا کر دہانے کو قبر کی صورت میں چنوا دیا۔ لیکن نیچے ایک تہہ خانہ بنوا کر اس غار میں جانے کے لئے ایک اور دہانہ بنوا لیا جس میں سے وہ اسے کھانا پہنچایا کرتا تھا اور اس سے موتی کا پتہ پوچھا کرتا تھا۔ وہ موتی جس کو میرے بھائی نے دشمن کے خوف سے نگل لیا تھا۔ اس کی اس تکلیف دہ زندگی کا باعث بن گیا۔ لیکن اس کی اس زندگی سے کسی کو بھی یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس غار میں زہریلی گیس ہے۔

جنگ کے بعد فاتح سردار نے میرے بھائی کی ایک گونگی لڑکی سے شادی کر لی مگر اس لڑکی سے بھی جو اولاد پیدا ہوئی گونگی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اب تک وہی گونگی نسل چلی آتی تھی۔

فاتح سردار کی موت کے بعد جب لوگ اس قصہ کو بھول گئے تو میں اس تہہ خانہ میں رہنے لگی اور جب مجھے معلوم ہُوا کہ میرا بھائی زندہ ہے تو سمجھ گئی کہ موتی ضرور اس کے منہ میں ہوگا۔ لہٰذا میں اسے برابر سمجھاتی رہی کہ وہ موتی کو

پھینک کر اس عذاب سے نجات حاصل کر لے۔ تاہم اس نے میرے کہنے پر عمل نہ کیا اور وہ عمل کرتا بھی کیسے موتی تو اس کے معدے میں تھا دوسرے وہ اپنے ہوش و حواس میں بھی نہ تھا۔ لیکن میں یہی سمجھتی رہی کہ وہ اپنی ہٹ پر قائم ہے۔ غرضیکہ میرا بھائی آٹھ صدیاں اس عذاب میں مبتلا رہا۔ گو اس نے مجھ پر انتہائی ستم توڑے تھے، پھر بھی میرا بھائی تھا۔ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی اس لئے آٹھ صدیاں برابر اس تہہ خانے میں اس کی نجات کے لئے دعائیں مانگتی رہی۔

انقلابِ زمانہ کے ساتھ یہ سب باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ نئی نسلوں نے اس کے متعلق کئی روائتیں گھڑ لیں لیکن اس کے باوجود ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا سیّاح اس روائتی موتی کی تلاش میں آتا ہی رہا۔ ان میں سے کوئی تو ٹھوکریں کھا کر ناکام لوٹ جاتا اور کوئی اس دھن میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

قصّہ مختصر میں آٹھ سو سال تک ان پروں کے لباس کی برکت سے زندہ رہ کر اس گونگے خاندان کو مخالفین کے ظلم و ستم سے بچاتی رہی۔ سوائے خانقاہ کے سجّادہ نشینوں کے جو میری زندگی کا راز سینہ بہ سینہ چھپاتے چلے آئے ہیں دوسرا کوئی بھی میری شخصیت سے واقف نہ تھا عام لوگ مجھے صحرائی روح کہتے تھے۔

میں نے اپنی اس طویل اور غیر دلچسپ زندگی کے دوران میں بہت کوشش کی کہ مختلف سانپوں کے زہر کا تریاق حاصل کر کے اس خاندان کو گونگے پن سے نجات دلواؤں مگر ناکام رہی۔ حتیٰ کہ یہ مور کے پر بھی جو ہر قسم کے سانپ کے زہر کا تریاق ثابت ہو چکے ہیں اس زہر کو دُور نہ کر سکے۔

روز بروز زمانہ بدلتا گیا۔ دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اوائل میں جو لوگ اس موتی کے واسطے آتے رہے، وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کی طرح چالاک اور منافق نہ تھے وہ جلدی مایوس ہو جاتے تھے۔ لیکن اس صدی میں آنے والے سیاح بہت نٹ کھٹ تھے جن کی وجہ سے ہمیں یہ مشکلات اُٹھانا پڑیں۔

آج سے تیس سال قبل یو۔ پی کا ایک آدمی اپنی بہن سمیت یہاں آیا۔ اور آسمانی باغ کا مالی بن کر کئی سال تک اس موتی کی تلاش کرتا رہا۔ اس کے بعد ایک ایرانی اپنی دو لڑکیوں کے ہمراہ آیا اور اپنی لڑکی کی شادی موجودہ گونگے سردار غنی سے کر کے اس کا نائب بن گیا۔ اس کی کامیابی سے جل کر مالی کو بھی ایک نئی چال سوجھی۔ یعنی ایک رات کو وہ آسمانی باغ سے غائب ہو گیا اور چند دن بعد ایک بلوچی کا بھیس بدل کر رستم کے نام سے یہاں وارد ہوا

اس نے آتے ہی ایرانی سے دوستی گانٹھ لی جس کی وساطت سے سردار غنی کا مصاحب بن گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اس نے ایرانی کو زہر دیکر ہلاک کر دیا اور خود نائب بن بیٹھا۔ بعد ازاں ڈاکٹر پال آیا۔ وہ منجم تھا اور اُسے

اس موتی کی تلاش نہ تھی جو کہ میرے بھائی کے معدے میں تھا بلکہ اُسے نجوم کے ذریعہ معلوم ہُوا تھا کہ چند سال بعد اس علاقہ میں ایک لڑکی پیدا ہوگی جس کے بلیدان سے وہ مور کا آنسو حاصل کر سکے گا۔ اسی غرض سے اس نے رستم کی اجازت سے چاندنی باغ میں تجربہ گاہ بنائی۔

دوسرے سال اسی خاص ساعت میں گوہر پیدا ہوئی جس کی پیدائش سے ایک سال بعد پال نے اس کی ماں کو اس کی بہن کے ہاتھوں ہلاک کرا دیا کیونکہ رستم نے اس کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ گوہر اٹھارہ سال کی عمر میں اسے دے دی جائے گی اور اس کے عوض ڈاکٹر پال ہر طرح کی مدد دے گا جس سے رستم قلعہ کا مالک بن جائے مگر قدرت کو یہ بات منظور نہ تھی اور مہر نے تمام بلا اپنے سر لے لی۔

اب پچھلے مہینے ایک پہاڑی آدمی فاطمہ کے پاس ایک سانپ اور چھٹی لایا یہ چھٹی جعلی غنی کی طرف سے تھی جس کا مضمون تھا کہ وہ لوگ قلعہ سے بھاگ کر سرزمین بانگھی میں ہیرے کی چٹانوں تک پہنچے اس کا کام ختم ہو چکا تھا اور پال نے اُسے معاوضہ دے کر رخصت کر دیا لیکن چونکہ اُسے مہر سے محبت تھی اور اس کے علاوہ وہ اس کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی اس لئے وہ خفیہ طور پر اس کے ساتھ رہا تاکہ موقع پاکر اُسے بھگا لے جائے۔

اسی ارادے سے وہ سادھو بن کر ناگ دیوتا کے اس مندر میں جو ہیرے

کی کان میں بنا ہوا تھا چھپ کر رہنے لگا۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ تھر پال کے ساتھ مندر میں آئی۔ وہ نشے کی حالت میں تھی۔ جب وہ دونوں اسی مندر میں کہیں غائب ہو گئے تو وہ دیر تک ان کا سراغ لگاتا رہا۔ آخر کار اسے معلوم ہو گیا کہ سانپ کی مورتی کے منہ میں چور راستہ ہے جس کے ذریعہ نیچے جا کر وہ ایک لٹکی ہوئی چٹان پر پہنچا۔ چٹان کے نیچے ایک گہری کھڈ تھی جس میں چراغ جل رہا تھا اور ہیروں کے عکس سے کھڈ روزِ روشن کی طرح جگمگا رہی تھی۔ کھڈ کے عین درمیان ایک فصیل نما چٹان تھی جس پر تھر اور پال کھڑے تھے۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا اژدہا بیٹھا تھا اور اس کے پیچھے ایک سفید رنگ کا مور۔

یکایک ایک زبردست ستارہ ٹوٹا جسے دیکھ کر سانپ اور مور دونوں نے سر اٹھایا اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکلے۔ معاً اسی دم ڈاکٹر پال نے تھر کو سانپ کے منہ میں دھکیل دیا لیکن جونہی لڑکی نے سانپ کو دیکھا وہ اس زور سے پھنکارا کہ آگ کے خوفناک شعلے نے پال اور لڑکی دونوں کو بھسم کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ سانپ کا آنسو سانپ بن گیا اور اس نے مور کا آنسو نگل لیا۔ صبح ہونے پر وہ وہاں سے واپس آیا اور اس پہاڑی آدمی کی مدد سے جس کے ہاتھ یہ چٹھی بھیجی گئی تھی اس نے یہ سانپ پکڑ لیا اور اسے ڈاکٹر پال کی تجربہ گاہ میں رکھنے کے لئے یہاں بھیج دیا۔ اس نے لکھا ہے کہ

اب اپنی محبوبہ کی حسرت ناک موت سے اس کا دل ٹوٹ چکا ہے اس لئے وہ اپنے گناہ کے کفارہ کی خاطر دنیا کو تج رہا ہے"۔

اس داستان کے خاتمہ پر ضعیفہ نے کہا۔ "عزیزمن میں جس کام کے لئے اب تک زندہ تھی وہ پورا ہو چکا ہے۔ اب مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ ابدی آرام کی۔ لہٰذا میری آخری وصیت ہے کہ یہ دو چیزیں یعنی ایک میرا لباس اور دوسری وہ چیز جسے میرے بھائی نے پیٹ میں رکھ کر آٹھ صدیوں تک عذاب جھیلا، اس طرح تلف کر دی جائیں کہ پھر کسی انسان کے ہاتھ نہ آسکیں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہفت رنگ موتی میرے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ وہی چیز تھی جسے میں چاند باز کی سفے میں اس روز دیکھ چکا تھا۔ بعد ازاں ضعیفہ نے اپنا پروں کا لباس اتارا اور خود ایک پُرمسرت ابدی خواب میں کھو گئی۔ اس کی وصیت کے مطابق تہہ خانہ کا دروازہ باہر سے چن دیا گیا۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد میں اور گوہر پھر اسی سمندری چٹان پہ کھڑے ہیں جہاں میں نے پہلی بار گوہر کو دیکھا تھا۔ رات کافی تاریک ہے اور آج ہم نے مقدس ضعیفہ کی امانت کو سمندر کی تاریک گہرائیوں میں غرق کر دیا۔

وادیٔ قاف

۱

ہوش سنبھالنے پر میں نے صرف ان تین آدمیوں کو گھر میں دیکھا یعنی ایک دادی اماں دوسرے بوڑھے باغ اور تیسری اس کی بیوی عظیمہ۔ یہی تینوں افراد تھے جن کے دم سے میری دنیا آباد تھی۔ بوڑھا باغ یوں تو ملازم ہی تھا مگر جاگیر کا کرتا دھرتا یہی تھا۔ سب لین دین اسی کے ذمہ تھا اور اس کی بیوی عظیمہ گھر کی مختارِ کُل تھی۔ سارا گھر اسی کے سر پر چل رہا تھا۔

ہم لوگ کانگڑے میں رہتے تھے مگر ہمارا وطن دراصل بٹالہ تھا۔ میرا

کوئی بڑا بوڑھا کسی زمانے میں فوجی عہدے دار تھا اور کانگڑے کی یہ جاگیر اس کو فوجی خدمات کے صلے میں ملی تھی۔ میرے باپ کی وفات کے بعد چونکہ دادی اماں کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے انہیں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر یہاں آباد ہونا پڑا۔

میرے والدین میری شیر خوارگی کے زمانے ہی میں مر چکے تھے۔ میں اکثر دادی اماں سے سُنا کرتا تھا کہ پچھلی جنگ کے خاتمہ پر جب جنگی بخار کی وبا ہندوستان میں پھیلی تھی تو میرے والدین بھی اس وبا کی نذر ہو گئے۔ دادی اماں کو میری پرورش کے علاوہ جاگیر کا سنبھالنا سخت مشکل ہو گیا مگر خدا مسبب الاسباب ہے ان کو اتفاقاً باغ اور عظیمہ جیسے وفادار اور جاں باز ملازم مل گئے۔ عظیمہ نے مجھے پرورش کیا اور باغ نے جاگیر کو سنبھالا اور اپنے حُسنِ انتظام سے دادی اماں کی گرتی ہوئی حالت کو دوبارہ سنبھال دیا۔ اس لئے مجھے سکھایا گیا کہ عظیمہ کو بے جی اور باغ کو بابا جی کہا کروں۔

باغ اور عظیمہ کہیں دُور دراز پہاڑوں کے رہنے والے تھے۔ پہاڑوں میں اکثر قحط پڑتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کے باشندے بے خاناں ہو کر اِدھر اُدھر کے علاقوں میں بھاگ آتے ہیں۔ باغ اور عظیمہ نے بھی کسی زمانے میں قحط ہی کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ادھر کا رُخ کیا تھا۔

کانگڑے میں ہماری حویلی چرن کنڈ سے میل بھر کے فاصلہ پر نیچے کی طرف

عین چرن کنڈ سے آنے والے نالے کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ نالہ ہماری حویلی کے دامنوں سے اٹھکیلیاں کرتا ہؤا آگے کو نکل جاتا تھا جس کے ساتھ ساتھ ہلا عظیم الشان باغ اس کو اپنے آغوش میں چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیتا تھا۔

یہ حویلی میرے پردادا کے وقت کی بنی ہوئی ہندوانہ طرز کی عمارت تھی۔ جا بجا دالانچے اور دلانچیاں تھیں۔ جن کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے باہر آڑے ترچھے گھونگھٹ اور آگے بڑھے ہوئے جالی دار چھجے بنے تھے اور اندر کی طرف بستے دار سرمدیاں لکڑی کے چترکار ستونوں پر کھڑی تھیں۔ چھتوں میں لمبے چوڑے اور فراخ "موکھے" بنے تھے جن کی کٹہرہ دار "جھنگلوں" کے ساتھ چوبی سیڑھیاں نصب تھیں اور ہر صحن کے ارد گرد جھرنے دار فصیلیں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کے کونوں پر چوبچہ نما اور کنگرے دار سنگین پیالے بنائے گئے تھے جن میں ہر وقت پرندوں کے لئے دانہ اور پانی موجود رہتا تھا۔ یہ حویلی پہاڑی لوگوں میں "ماڑی" کے نام سے مشہور تھی۔

اس حویلی کی بالائی منزل سے کانگڑہ کا مندر اور شہر کا آدھا حصہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ حویلی کی درمیانی منزل نہایت خوش قطع تھی۔ دالانچوں کے بستے اور ستون اعلیٰ چترکاری کا نمونہ تھے۔

چنانچہ اسی ایک دالانچہ میں جس کے بستے نالے کی طرف عین پانی کے اوپر کھلتے تھے، دادی اماں کی نشست گاہ تھی جس میں عمدہ عمدہ قالین اور اعلےٰ

قسم کی چاندنیاں لگی رہتی تھیں۔ یہاں مجھے دن کا بیشتر حصہ گزارنا پڑتا تھا۔ ایک ٹوکری میں کاغذ کی ناویں بھری رہتی تھیں اور میں دھاگے میں بندھی ہوئی کاغذ کی ناؤ کو اوپر ہی سے بیٹھا بیٹھا نالے میں بہا کر کھیلا کرتا اور ایک ناؤ کے ضائع ہونے پر دوسری ناؤ مل جاتی۔ کبھی کبھی میں اس کھیل سے اکتا کر دادی اماں یا بے جی عظیمہ کو ستانے لگتا تو بوڑھا باغ مجھے کندھے پر اٹھا کر باہر لے جایا کرتا تھا۔

نالے کے پار ہماری جاگیر میلوں لمبے چوڑے علاقے کو گھیرے ہوئے تھی جس میں جا بجا مزارعوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی عورتیں دن بھر ریٹھے کے گھنگریلے درختوں کی چھاؤں میں چرخے کاتا کرتیں اور بچے گلی ڈنڈا کھیلا کرتے۔ مگر ان لوگوں کو حویلی کی طرف آنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ دادی اماں اس علاقہ کے باشندوں سے بہت بدظن تھیں۔ وہ ان عورتوں کو ڈائنیں اور بچوں کو چھلاوے کہا کرتی تھیں۔ مگر میری دلچسپی کا سامان احاطہ کے اندر ہی موجود تھا۔ احاطہ میں صرف دو کوارٹر آباد تھے۔ ایک میں مہتر اور دوسرے میں مالی رہتا تھا۔ مہتر تو خیر مجرد تھا لیکن مالی عیال دار آدمی تھا۔ لاّلی اور میلو دو نیم جوان لڑکیاں تھیں اور ایک زردرو مالن جس کا نام دھنو تھا۔ اور یہ مالی کا کنبہ دادی اماں کا منظورِ نظر تھا۔ انہیں کھلے بندوں حویلی میں آنے جانے کی اجازت تھی اسی لئے مجھے بھی بوڑھا باغ وہاں لے جایا کرتا تھا۔

لالی تو دن بھر اپنے جہیز کے کپڑے کاڑھا کرتی لیکن نیلو اور دھنّو ہمارے گھر کا سوت کاتنے اور ازار بند بنانے میں مصروف رہتی تھیں۔ یہ تینوں ماں بیٹیاں مجھے بہت چاہتی تھیں۔ میں ان کو بہت ستایا کرتا۔ ان کے چرخے کے تکلے توڑ ڈالتا اور ازار بند کے کرگھے کو اُلٹا پلٹا کر کے تانے کی تیلیوں کو نوچ کھسوٹ ڈالتا۔ میرے ستانے پر وہ طرح طرح کے کھیلوں سے مجھے بہلایا کرتی تھیں۔

ایک دن بوڑھے باغ کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ وہ مجھے اُن لڑکیوں کے پاس چھوڑ کر خود دھوپ میں لیٹ رہا۔ میں نے اپنی شرارتوں سے انھیں بہت تنگ کیا آخر میلو کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"بھیّا اگر تم شرارتیں نہ کرو گے تو ہم تمہیں ایک بڑی اچھّی چیز دیں گے"۔

پھر اس نے مجھے اندر سے ایک دوشاخی سی لکڑی نکال کر دی جس کے دونوں سروں پر ربڑ کا تسمہ بندھا ہُوا تھا۔ اس چیز سے مجھے بہت دیر تک چڑیوں کو نشانہ بنا کر دکھاتی رہی۔ اس لکڑی کا نام اس نے مجھے غلیل بتایا۔

میں غلیل پا کر بہت خوش ہُوا اور شرارتیں چھوڑ کر غلیل بازی میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب بوڑھا باغ بیدار ہُوا تو میرے ہاتھ میں غلیل دیکھ کر میلو پر بہت خفا ہُوا اور غلیل میرے ہاتھ سے چھین کر توڑ ڈالی۔ غلیل کے چھن جانے کا مجھے بہت صدمہ ہُوا۔ میں بہت چیخا چلایا مگر اس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ میں

نے دادی اماں سے فریاد کی تو انہوں نے بھی سُنی اَن سُنی کر دی۔ بے جی عظیمہ سے کہا تو وہ مجھے ڈرانے لگی کہ پرندے نیک لوگوں کی روحیں ہوتے ہیں۔ جو انہیں ستائے وہ اُسے بد دعا دیتے ہیں اور بد دعا بہت خطرناک چیز ہے۔ پھر وہ ان پرندوں کے متعلق طرح طرح کے قصے بیان کرنے لگی۔ اس کے یہ قصے بیحد دلچسپ تھے۔ میں نے بڑے شوق سے سُنے اور رفتہ رفتہ مجھے ان بے سرِ پا باتوں کا ایسا چسکا پڑا کہ میں بے جی سے روزانہ ان قصوں کی فرمائش کرنے لگا اور یوں مجھے نئی نئی قسم کی کہانیاں سُنائی جانے لگیں۔

ان کہانیوں میں سے ایک کہانی مجھے بہت پسند تھی جسے بے جی اس طرح بیان کرتی کہ ہاتھی دھار کے اُن بلند اور آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کے پیچھے جو افق کے دھندلکے میں بادلوں کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں ایک عظیم الشان وادی ہے۔ جس کو بڑے بڑے طویل و عریض پہاڑوں کی حیران کُن بلندیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ اس وادی تک انسان کا گزر محال ہے اور ان چوٹیوں پر روشنی اس قدر تیز ہے کہ کسی جان دار کی بینائی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ سفر صرف پرندے ہی طے کر سکتے ہیں کیونکہ ان پہاڑوں میں ممیرے کی کثرت ہے اور ممیرے کی جھاڑیوں سے اپنی آنکھیں مل مل کر وہ دوبارہ بینائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں سلاجیت کے چشمے بھی جاری ہیں جسے کھا کر وہ اپنی طاقت بحال کر کے بالکل تازہ دم ہو جاتے ہیں۔

اس وادی میں ہمیشہ موسم بہار رہتا تھا۔ نہ بارش کی زیادتی نہ دھوپ کی شدت۔ وہاں سونے چاندی کی پہاڑیاں ہیں۔ فیروزہ، عقیق، نیلم اور پکھراج کی چٹانیں۔ وہاں کی زمین ابرق کی ہے اور پانی میں بھی ابرق کی شمولیت ہے چنانچہ وہاں کی ندیوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ان میں بجائے پانی کے سچے موتیوں کا برادا بہہ رہا ہے۔ وہاں کے باشندے حسن و جمال میں لاثانی ہوتے ہیں ان کی خوراک صرف پھل ہے اور کپڑا بھی پھولوں کے ریشوں سے تیار کرتے ہیں وہاں جب کبھی کوئی پیدا ہوتا ہے تو فضاؤں میں خود بخود شیریں نغمے بلند ہوتے ہیں اور جب کوئی مرتا ہے تو ہوائیں غمگین راگ الاپنے لگتی ہیں اور یکدم پھولوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مردہ پھولوں کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ اس وادی کا نام ہے کیف جسے لوگوں نے بگاڑ کر قاف بنا دیا ہے

یہ وادی دراصل دیوتاؤں کی سیرگاہ ہے۔ جب کبھی کوئی دیوتا اپنی علاقائی ذمہ داریوں سے تھک جاتا ہے تو اس سرزمین پر جا کر آرام کرتا ہے۔ اسی لئے یہ سب خوبیاں اس وادی میں بھر دی گئی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ان لوگوں کے پر بھی ہوتے تھے جن کے ذریعے وہ پرندوں کی طرح اڑتے پھرتے تھے۔ مگر بعد میں یہ پر ان سے چھین لئے گئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی نامعلوم زمانہ میں ایک سادھو نہ جانے کس طرح وہاں پہنچ گیا اور کچھ دنوں کے قیام سے اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس وادی میں نمک نہیں ہوتا۔

سادھو کے پاس کچھ نمک تھا۔ اس نے اس غرض سے وہاں کے باشندوں کو نمک کی چاٹ لگادی تاکہ وہ اپنے پروں پر اُٹھا کر اس کو اُن پہاڑوں کے پار اُتار آئیں۔

اس کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے اور اس شرط پر کہ وہ پھر بہت سا نمک لے کر اس وادی میں واپس آئے، ان لوگوں نے اُسے پروں پر اُٹھا کر پہاڑ کے دوسری طرف اتار دیا۔

لیکن جب ایک عرصہ تک سادھو واپس نہ آیا تو وہاں باقاعدہ ایک جماعت بن گئی جو ترکِ وطن کر کے نمک والے ملک میں جانے کی مشتاق تھی۔ اس جماعت میں لڑکوں کی نسبت لڑکیاں زیادہ تھیں۔ غرضیکہ یہ قافلے بنا کر اپنے وطن سے ہجرت کرتی رہیں۔

یہ حالت دیکھ کر اندر دیوتا کو جو اس وادی کا حکمران تھا بہت تشویش ہوئی چنانچہ اس نے اپنی دیوتائی قوت سے ان کے پر ہی نابود کر دیئے۔ اور اس کے علاوہ بھوتوں کو حکم دے کر کسی ٹوٹے ہوئے ستارے کا خول اس وادی کے ارد گرد چڑھوا دیا تاکہ کسی طرف سے بھی خطرے کا امکان باقی نہ رہے۔

یہ سب کچھ ہو گیا مگر لوگ نمک کا مزا نہ بھول سکے۔ بلکہ ان کا شوق روز بروز ترقی کرتا رہا۔ وہ نمکین دنیا میں جانے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں سوچنے لگے انہی دنوں ایک دفعہ کیفی بچوں نے کہیں جنگل میں پرندے پکڑنے کے لئے

چھوٹا سا جال لگا رکھا تھا تاکہ ان کے پر اپنی کلغیوں کے لئے حاصل کر سکیں اتفاقاً اس جال میں گرڑ مہاراج یعنی نیل گنٹھ دیوتا پھنس گئے۔ بچے ان کے خوبصورت پروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کے پَر نوچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ گرڑ مہاراج پہلے ہی بچوں کے چنگل میں پھنس کر پریشان ہو رہے تھے اب اپنے پروں کے ضائع ہونے کے خیال سے بہت ہی چکرائے۔ اُنہوں نے بچوں سے کہا۔ "دیکھو میں دیوتا ہوں اگر تم میرے پروں کو خراب کروگے تو میں تمہیں سراپ دونگا۔"

بچوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم دیوتا ہوتے تو جال ہی میں کاہے کو پھنستے۔"

یہ جواب سُنکر گرڑ مہاراج لاجواب ہو گئے اور انہوں نے بال ہٹ سے مجبور ہو کر کہا۔

"اچھا میری آزادی کے عوض جو چاہو مجھ سے مانگ لو۔"

اُن بچوں کی سرغنہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اس نے کہا۔

"اچھا ہمیں کوئی ایسا منتر بتا دو کہ ہم بھی تمہاری طرح پرواز کر سکیں۔

گو اس لڑکی کا مطالبہ بہت بڑا تھا مگر گرڑ مہاراج بھی قول ہار چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے لڑکی کو ایک ایسا منتر بتایا کہ وہ اس کے ذریعہ پرواز کرنے پر قادر ہو گئی۔ وادی والے یہ چیز پاکر بہت خوش ہوئے۔ اس منتر کے

زور پران کی آمد و رفت پھر میدانی علاقوں میں شروع ہو گئی۔ لیکن چونکہ ٹوٹے ہوئے ستارے کا خول چڑھنے سے اب وادی کے ارد گرد وہ ایسے پہاڑوں کے کنگرے بے حد اونچے ہو چکے تھے اس لئے ان کا یہ شوق اُدھورا ہی رہا۔ سیاحوں کی رفتار زیادہ زور نہ پکڑ سکی۔

اس کہانی کو بے جی عظیمہ ہمیشہ نئے انداز میں سنایا کرتی تھیں اور میں پورے انہماک سے سُنا کرتا۔ بلکہ بعض اوقات سوچا کرتا کہ کیا ہی اچھا ہو کر گرڑ مہاراج کسی طرح میرے ہاتھ بھی لگ جائیں اور اُن سے اُڑنے کا منتر سیکھ کر وادی کیف کی سیر کروں۔

عمر کے ساتھ ساتھ میری یہ آرزو بھی بڑھتی گئی۔ میں پہروں انہی خیالات میں ڈوبا رہتا۔ خاص کر دوپہر کے وقت جب میں حویلی کی چھت پر اکیلا کھیلتا ہوتا اور چیلیں اپنے مضبوط، نوک دار خمیدہ پروں اور خیاط قدرت کی تراشی ہوئی دُموں کو پھیلا کر فلک کی نیلی چھتری کے خوشنما اور خوش رنگ سایوں میں چکر کاٹتیں اور نصرینلی رواق کے بے کنار دامنوں کو چھوتی ہوئی قلابازیاں لگاتیں، تو میں بھی آسمانی فضاؤں میں ان کے ساتھ اُڑنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔

ایک عرصہ تک میں انہیں تصوّرات اور تخیّلات کے گرداب میں پھنس کر ذہنی ارتقاء سے محروم رہا۔ اور انہی دلچسپیوں نے مجھے پرندوں کا شائق بنا دیا۔ مگر اپنے اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے وسائل مجھے مہیّا نہ تھے۔ اس وقت مجھے

وہ غلیل اکثر یاد آیا کرتی تھی جو کبھی مجھے میکو نے دی تھی۔ میں اس وقت آہ بھر کر رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ جب سات سال کی عمر کو پہنچا تو ماسٹر محمد رمضان مجھے پڑھانے کے لئے آنے لگا۔ ایک دفعہ اس نے میری سال گرہ کے موقع پر مجھے ایک چھوٹی سی بندوق تحفتاً دی جس میں باریک چھرّے رکھ کر چلائے جاتے تھے۔

اس بندوق کو دیکھ کر باآغ اور عظیمہ نے سخت مخالفت کی مگر اس دفعہ میں نے بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جس سے دادی اماں اس فیصلہ پر مجبور ہو گئیں کہ بندوق تو میرے پاس ہی رہے مگر کسی پرندے کو زخمی نہ کروں۔ صرف سامنے والی دیوار پر نشانہ بازی کیا کروں۔ لیکن اس فیصلہ پر باآغ اور عظیمہ کی تسلی نہ ہوئی وہ ندر پر وہ کوشش کرنے لگے کہ مجھ سے ذرا سی لغزش ہو اور بندوق ضبط کر لی جائے۔ مگر میں بھی اب بہت چتر ہو چکا تھا۔ میں نے کبھی ان کو ایسا موقع نہ دیا۔ کیونکہ میں اپنا شوق ہر جمعرات کو پورا کر سکتا تھا۔

ہر جمعرات کو ظہر کی نماز کے بعد باآغ اور عظیمہ کا معمول تھا کہ دونوں میاں بیوی بن سنور کر علی امام کی خانقاہ پر چراغی چڑھانے چلے جایا کرتے تھے۔ یہ خانقاہ چونکہ ہماری حویلی سے قریباً چار پانچ میل کے فاصلہ پر تھی اس لئے وہ شام سے پہلے واپس نہ آ سکتے تھے۔ چنانچہ ہر جمعرات میرے لئے عید کا پیغام لاتی اور میں جی کھول کر اُن چڑیوں کو اپنی بندوق کا نشانہ بنایا کرتا جو شام کے قریب جھرمٹ میں اکٹھی ہو کر چہچہایا کرتی تھیں۔

ایک دفعہ جبکہ باغ اور عظیمہ علی امام کی خانقاہ پر گئے ہوئے تھے تو میں نے ایک ممولہ کو نشانہ بنایا۔ ننھا منا، شوخ و شنگ ممولا فوراً نیم بسمل ہو کر فرش پر گرا۔ میں لپک کر اُسے اٹھانے کے لئے دوڑا تو ٹھوکر کھا کر منہ کے بل جا پڑا جس سے میرے سامنے والے دانت کو ضرب آگئی۔ ممولے کو جب میں نے اٹھایا تو وہ مر چکا تھا۔

اُس شوخ اور پھرتیلے پرندے کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ میں اُسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا جرم چھپانے کی خاطر فوراً اُسے نالے میں پھینک دیا۔ اسی رات مجھے معلوم ہوا کہ میرا دانت ہل رہا ہے اور وہ دانت دوسرے دن نکل بھی گیا۔ اس دانت کے بعد دوسرے دانت بھی ایسے گرنے شروع ہوئے کہ دس بارہ دن کے اندر اندر سامنے والے آٹھوں کے آٹھ دانت صاف ہو گئے جس سے مجھے وہم ہو گیا کہ یہ اس معصوم ممولا کو ہلاک کرنے کی سزا مل رہی ہے۔ لہذا میں نے آئندہ کے لئے اس فعل سے توبہ کر لی اور اس کے بعد جب میرے نئے دانت نکلنے شروع ہوئے تو میں سچ مچ روحوں کا قائل ہو گیا اور سمجھا کہ میری توبہ قبول ہو گئی ہے۔

ان ہی ایام میں ایک دن دوپہر کو میں بے جی عظیمہ کے پاس بالاخانے پر کھلے آسمان کے نیچے اپنی کھٹولی پر پڑا چیلوں کو تک رہا تھا۔ پھاگن کے آخری دن تھے۔ آسمان کی نیلی محراب کا در پوری طرح کشادہ تھا۔ نئی رُت

کے اثر سے فضا کچھ غیر معمولی طور پر روشن ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ سے آسمان کی نیلاہٹ بھی زیادہ تیز دکھائی دیتی تھی۔

یکایک مجھے روحوں کا خیال آیا۔ میں نے طفلانہ انداز سے کہا۔

"بے جی کیا چیلیں بھی کسی کی روحیں ہوتی ہیں جو اس شان سے آفتابی شعاعوں کی شفاف قنات کے ساتھ ساتھ ہوا میں تیر سکتی ہیں"۔

عظیمہ سر اونچا کر کے چیلوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو حدِ نگاہ سے پرے بالکل فرشتوں کی دنیا کے قریب نہایت نفاست سے محوِ پرواز تھیں۔ دفعتاً اس کا چہرا کملا گیا۔ وہ اداس ہو کر کہنے لگی۔

"بیٹا یہ پرندے تو جنّت کے باسی ہیں"۔

میں نے معصومانہ تعجب اور طفلانہ جوش سے کہا۔ وہی جنّت جس کے کنجی بردار علی امام ہیں۔

میں اکثر باغ اور عظیمہ سے سُن چکا تھا کہ علی امام جن کی خانقاہ پر وہ چراغ چڑھانے جایا کرتے تھے جنّت کے کنجی بردار ہیں۔

"ہاں وہی جنت"۔ وہ سرد آہ بھر کر کہنے لگی۔

اُسے آزردہ پا کر خاموش ہو گیا اور نیچے جا کر دادی اماّں سے جنت کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جنّت زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد اُس شخص کو ملتی ہے جو اپنی زندگی میں نیک کام

کرتا ہے اور انھوں نے مجھے نیک کام بھی بتائے اس کے بعد میں پکا نمازی بن گیا اور دادی اماں سے قرآن کا درس بھی لینے لگا۔ مگر یہ سب کچھ اس جنت کے حصول کی خاطر کر رہا تھا جس کے متعلق مجھے صرف اتنا پتہ تھا کہ نیک لوگ مرنے کے بعد وہاں چیلیں بن کر آباد ہوتے ہیں اور وہاں کے کنجی بردار علی امام ہیں۔ اس کے علاوہ میں اپنے جمع شدہ پیسے بھی ہر جمعرات باغ اور عظیم کو دے دیتا کہ وہ خانقاہ پر میری طرف سے بھی چراغی چڑھا دیا کریں۔ گویا میں اپنے خیال میں علی امام کو رشوت دے رہا تھا اور یہ ساری کوششیں محض اس لئے تھیں کہ چیل بن کر نیلی فضا میں پرواز کا شوق پورا کر سکوں۔

خیر اس کارِ ثواب کا اجر تو مجھے چند دنوں میں ملنا شروع ہو گیا یعنی دادی اماں نے جب دیکھا کہ میں شوخی اور شرارتیں ترک کر کے ایک نیک فرمانبردار لڑکا بن رہا ہوں تو انھوں نے مجھے مولوی کا خطاب دے دیا اور گھر میں میرا وقار پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ بہرکیف سکول کا زمانہ تو میرا اسی خبط میں بسر ہوا مگر میٹرک پاس کرنے کے بعد جب میں سولہ سال کی عمر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے امرتسر کالج میں داخل ہوا تو مجھے بھی دنیا کی ہوا لگی اور اپنے بچپن پر تعجب ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ میں مولوی پن چھوڑ کر باقاعدہ جنٹلمین بن گیا۔

گو دادی اماں میرے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر مجھے نصیحتیں کرتیں مگر میں نہایت خوش اسلوبی سے انہیں ٹال دیا کرتا۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ میں

ابھی فورتھ ایر ہی میں تھا کہ دادی اماں کا انتقال ہو گیا اور خانگی ذمّہ داریوں کے پیشِ نظر مجبوراً مجھے تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔

میں ابھی ناکتخدا تھا۔ باغ اور عظیمہ چاہتے تھے کہ میں شادی کر کے اپنا گھر بساؤں لیکن میں ایسی اندھی شادیوں کے خلاف تھا۔ اسی ردّ و کد میں ایک سال گزر گیا۔ ایک دن باغ میں مَیں نے بے جی عظیمہ کے پاس ایک اجنبی عورت بیٹھی ہوئی دیکھی۔ یہ عورت بہت بدرو سانولی رنگت کی تھی۔ اس کے بال بالکل سفید دودھ جیسے تھے اور خدوخال بہت بے ہنگم اور بھدے تھے۔ وہ بے جی عظیمہ سے کچھ کھُسر پھُسر کر رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

کچھ دیر بعد جب بے جی عظیمہ کسی کام کے لئے اندر آئی تو میں نے اس عورت کے متعلق دریافت کیا۔ بے جی نے بتایا کہ علی امام کی خانقاہ کے مجاور کی بیوی ہے۔ میں نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ یہ کوئی چڑیل معلوم ہوتی ہے"۔

بے جی کہنے لگی۔ "نہیں نہیں یہ بے چاری بڑی اچھی ہے"۔

میں نے مزاحاً کہا "تو شاید یہ بھی جنّت میں جائے گی"۔

بے جی نے جواب دیا۔ "ضرور"

میں نے چڑ کر کہا۔ "اور شاید جنّت کی حور بھی تو یہی ہو گی"۔

بے جی نے تُنک کر کہا "تو حوروں کے کون سے لعل لگے ہوں گے"۔

میں نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ جنت بھی کس کام کی جس کی حوریں اتنی ڈراؤنی ہوں اور گنجی بر دار بھی گیا۔

ابھی یہ فقرہ میرے منہ ہی میں تھا کہ وہ بگڑ کر بولی۔ "بس خبردار آگے کوئی بے ادبی کی بات منہ سے نہ نکالنا"۔

میں ہنس پڑا اور وہ جھلا کر بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

لیکن رات کو جب بے جی عظیمہ کی بجائے بابا باغ مجھے کھانا کھلانے لگا تو محسوس ہوا کہ شاید بے جی مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"آج بے جی کہاں ہیں۔

باغ نے کہا۔ وہ "علی امام کی خانقاہ پر گئی ہے"۔

میں نے تعجب سے کہا "آج بغیر جمعرات کے کیسے چلی گئی ہیں"۔

باغ نے کہا "اسے وہاں کچھ کام تھا"۔

میں نے پوچھا "تو واپسی کب ہو گی"۔

باغ نے کہا بتا کر تو کچھ نہیں گئی۔ کیونکہ ہمارے دیس کے کچھ آدمی وہاں آئے ہوئے ہیں اس لئے وہ آج ان کے پاس ٹھہرنا چاہتی تھی۔

جب دوسرے دن بھی بے جی گھر نہ آئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور روٹھ گئی ہے اب میں اپنی غلطی پر سخت نادم ہوا اور تیسرے دن صبح دس بجے کے قریب بوڑھے باغ کی معیت میں خود اسے منانے کے لئے روانہ ہوا

۲

اساڑھ کا مہینہ تھا۔ ہم لوگ دس بجے گھر سے نکلے اور سورج کنڈ تک پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی دوپہر ہو گئی۔ چلچلاتی دھوپ سے کانگڑہ ویلی آتش کدۂ نمرود کو مات کر رہی تھی۔ کوئلوں کی طرح سُلگتی ہوئی زمین پر اُگے ہوئے سوختہ تن بوٹوں کی تپ انگیز لو سے دماغ چکرانے لگا۔

ہم تھوڑی دیر سورج کنڈ میں دم لینے کے بعد آگے بڑھے۔ راستہ نہایت خشک ویران اور بے رونق تھا۔ ہر طرف پتھروں کے ڈھیر اور برباد شدہ عمارتوں کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ ایک طرف ایک شکستہ شوالہ گزشتہ زلزلے کے پُرہول جھٹکوں سے اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ یہ زمین پر لیٹا ہوا شوالہ بالکل ایک خوفناک اژدھے کی طرح زمین کی اکھڑی بکھری خام چھاتی میں اپنے سنگین ناخن گاڑے رینگتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان خستہ سامانیوں کو دیکھ کر میری رفتار سُست پڑ گئی۔ مگر باغ کے کہنے پر کہ یہاں سانپ بہت ہوتے ہیں اس خطّے کو جلد عبور کرنا بہتر ہے۔ میں نے پھر تیز روی اختیار کی۔ میں حیران تھا کہ باغ اور عظیمہ ہر جمعرات کو ادھر آنے کا کس طرح حوصلہ کرتے ہیں۔ کیا اُس جنّت کا شوق انہیں کھینچ لاتا ہے جس کے کنجی بردار بقول ان کے علی امام ہیں۔ خواہ اس جنّت کی حقیقت کچھ بھی نہ ہو مگر ان کی عقیدت

کی پختگی ضرور قابلِ قدر تھی۔

خدا خدا کر کے یہ کافر رستہ ختم ہُوا تو سنگین سیڑھیاں شروع ہو گئیں جو کئی گھماؤں مار چکروں پر اگٹ پھیر کھاتی ہوئی نیچے کھڈ کی طرف جا رہی تھیں اور یہ اَن گنت سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم لوگ تحت الثریٰ میں پہنچے جہاں کھڈ والی میں ڈھنڈ تک ایک نالہ بہہ رہا تھا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر پہاڑ کے دامن میں ایک چوڑا راستہ تھا جس کے آخری سرے پر ایک سیندور آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک بھیانک اور طلماتی مندر کا تھا۔ یہاں کی فضا اس قدر دہشت خیز اور ڈراؤنی تھی کہ میں کانپ کر رہ گیا۔

اب ہم لوگ مندر کی بیرونی کارنس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پچھواڑے کی طرف جا کر پگڈنڈی کے ذریعہ اگلے پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ آگے جنگل بہت ہی بے ڈھب اور گھنا تھا۔ جس میں مُڑی تڑی بے تکی جھاڑیاں ایک دوسری کے اوپر پڑھی ہوئی تھیں اور کوڑھی چھال والے بے روپ درخت آپس میں گتھے ہوئے تھے۔ پگڈنڈی کے کناروں پر پاؤ پاؤ بھر کے بچھو رینگتے دکھائی دیتے تھے اور چٹانوں کے پسِ پردہ دراڑوں کی دامنی تہوں سے سانپوں کی پھنکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

بڑی مشکل سے ہم لوگ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔ جہاں پتھروں کی چاردیواری

میں علی اماؑم کی خانقاہ تھی جس کے ارد گرد اور بھی کئی قبریں تھیں اور ایک طرف مجاور کا گھر تھا۔

ہم لوگ سیدھے مجاور کے گھر کی طرف گئے جہاں ریٹھے کے گھنگریلے سایہ میں کھٹولی پر ایک خوش گل لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ باغ نے اُسے متاعوا متاعوا کہہ کر پکارا۔ لڑکی اُٹھ بیٹھی۔ باغ نے عظیمہ کے متعلق دریافت کیا تو متاعوا نے بتایا کہ وہ دونوں بوڑھیاں لڑکیوں کے ساتھ اچھرہ کنڈ پر گئی ہیں۔ باغ نے کہا۔ "جا انہیں بلا لا"۔

یہ لڑکی مجاور کی بہو تھی جو باغ کے حکم پر اُٹھی اور جنگل میں دھنسی ہوئی پگڈنڈی کے راستے سے نیچے کی طرف اُتر گئی۔ اس کے جانے پر باغ کہنے لگا۔ "اگر پہلے ہی پتہ لگ جاتا کہ عظیمہ اچھرہ کنڈ پر ہے تو ہم لوگ اتنی چڑھائی کیوں چڑھتے"۔

میں نے پوچھا "تو کیا اچھرہ کنڈ کہیں راستے ہی میں تھا"۔

باغ نے کہا۔ "ہاں وہ زینہ ختم ہونے کے بعد چوڑے راستے کے آخری سرے پر جو مندر تھا وہی اچھرہ کنڈ ہے"۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ "اوہ تنگ و تاریک سا مندر ظلمات کا بڑا بھائی"۔

باغ نے کہا۔ "شاید تم مندر کی بیرونی شکل و صورت سے یہ اندازہ لگا رہے ہو ورنہ وہ تو بڑی دلآویز جگہ ہے۔ اسی لئے تو اُسے اچھرہ کنڈ یعنی پریوں

کا تالاب کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر بوڑھا باغ جو حقے کی جستجو میں مجاور کے گھر میں گھس گیا اور میں انتظار سے اُکتا کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ یہاں سے اطراف و جوانب کا سب منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ نیچے نالہ سامنے سیاہ کنکریلے پہاڑ، بازو پر گرد آلود باغات، جن کے پھٹے چھلکے والے درخت اور کھردرے پتوں والے بھورے رنگ کے بیل بوٹے تپش سے جُھلسے ہوئے معلوم ہوتے تھے، دوسری طرف ایک سفید فیتے کی طرح بے ترتیبی سے بکھرا ہُوا نالہ جس کے کناروں پر بے شمار دھوبی چھُوا چھُو کا اداس نغمہ الاپ رہے تھے اور سیدھ پر وہی اکٹ پھیر کھاتا ہُوا ویران راستہ اور نکڑ کی جانب سے شہر کا کچھ حصّہ۔ مگر یہ سب نظارا دامن دیدہ اور غیر دلچسپ تھا کہ خواہ مخواہ طبیعت اچاٹ ہوتی تھی۔

میں بے چینی سے بار بار پگڈنڈی کو دیکھتا تھا۔ یکایک سامنے سے بے جی عظیمہ نمودار ہوئی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ بے جی حیران ہو کر کہنے لگی۔

"تم یہاں کیسے آئے۔"

میں نے کہا "تمہیں لینے آیا ہوں۔"

بے جی کہنے لگی۔ "تو میں کیا کہیں بھاگی جاتی تھی۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم روٹھی ہوئی ہو۔"

وہ محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "پگلے تمہیں چھوڑ کر

کہاں جا سکتی ہوں۔ میں تو ان لڑکیوں کی خاطر دو دن ٹھہر گئی"۔ بے جی نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ یکدم میری نظر بے جی کے اشارے کی طرف اٹھی۔

تھوڑی دور تین لڑکیاں اکٹھی کھڑی تھیں جنہیں دیکھ کر میں بھونچکا سا رہ گیا ان میں سے دو لڑکیاں تو صرف حسین ہی تھیں مگر تیسری لڑکی کا بے مثل حسن تعریف و توصیف سے بے نیاز تھا۔ یہ لڑکی کیا تھی گویا شرابِ حسن کا ایک چھلکتا ہوا جام تھا۔ اس کا نازک جسم شاید چاند کی لطیف کرنوں سے بنایا گیا تھا اور اس کا پاکیزہ جمال اندھیرے میں اجالا کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ وہ کھدر کے پرانے ملگجے لباس میں ایک شفاف اور مجلا ہیرے کی طرح دمک رہی تھی۔

بے جی نے ان لڑکیوں سے مجھے بالکل معمولی اور سادہ طریقے سے روشناس کرایا۔ اِس شمعِ حسن کا نام گلنو تھا اور دوسری دو لڑکیوں میں سے ایک کا نام گلابہ اور ایک کا گل قندی تھا۔ خیر کچھ دیر بعد میں نے بے جی سے گھر چلنے کو کہا مگر وہ خاموش سی ہو گئی۔ شاید وہ ابھی یہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ بوڑھے باغ نے اس کے ارادے کو بھانپ کر کہا۔

"اگر ان لڑکیوں کے لئے یہاں ٹھہرنا چاہتی ہو تو پھر بہتر ہو گا کہ انہیں بھی ساتھ لے چلو"۔

مجھے بوڑھے باغ کی تجویز بہت پسند تھی میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لہٰذا بے جی ان کو اپنے ساتھ لے آئی۔

کچھ دن تک تو یہ جنگلی لڑکیاں نئے ماحول سے بہت غیر مانوس رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر متوحش ہو کر سہم جایا کرتیں خصوصاً مجھ سے بہت ڈرتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ وہ کچھ شائستہ اور سمجھ دار ہوتی گئیں اور مستقل طور پر ہمارے گھر میں رہنے لگیں۔

ان کے آنے سے ایک تو ہماری حویلی میں چہل پہل ہو گئی۔ دوسرے انہوں نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ بے جی نے خوش ہو کر انہیں نئے کپڑے سلوا دیئے جس سے ان کے حسن و جمال میں اور بھی اضافہ ہوا۔ یہ لڑکیاں کام کاج سے فارغ ہو کر ریشمے کے گھنگریلے درخت میں پڑے ہوئے جھولے پر جھولا کرتیں اور جب میں انہیں کھیلتے دیکھتا تو میرے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی کہ میں ان کی دلچسپیوں میں شریک ہو سکوں۔ لیکن وہ مجھ سے دُور دُور رہتی تھیں آخر کچھ دنوں کے بعد میں نے خواہ مخواہ اُن کی ٹولی میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ میرے اس طرح دخل انداز ہونے پر پہلے تو بہت گھبرائیں مگر کچھ عرصہ بعد وہ میری سینہ زوری کی خوگر ہو گئیں۔

گلنو جسے میں گلِ نو کہا کرتا تھا، اپنی ہمجولیوں کی نسبت زیادہ مہذب اور عقلمند تھی۔ ادب و آداب کا زیادہ خیال رکھتی تھی۔ لیکن ان لڑکیوں میں ایک بھاری نقص بھی تھا۔ یعنی جس دن متاعو ان سے ملنے آتی تو یہ پھر وحشی بن جایا کرتیں اور اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جاتیں کیونکہ وہ کھیل کود

کی بہت مشتاق تھیں اور ان کا یہ جذبہ متاعوا سے مل کر زیادہ ابھرنے لگتا۔ بے جی کو بھی ان کی یہ حرکت ناگوار گزرتی۔

ایک دن بے جی نے میری منت کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکیاں بالکل شتر بے مہار ہیں۔ میں تھوڑا سا وقت ہرج کر کے قرآن مجید کا سبق دے دیا کروں۔" میں نے منظور کر لیا اور میرا گھر دوسرے دن ہی چھوٹا سا سکول بن گیا۔ اور میں سکول ماسٹر۔ یہ لڑکیاں بہت ذہین ثابت ہوئیں۔ چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں انہوں نے دس دس پارے اور اُردو کی دو دو کتابیں بھی پڑھ لیں۔

اس استادی شاگردی کے دوران میں گلِ نو کی محبت میرے دل میں پرورش پاتی رہی لیکن میں نے اپنے خیالات کا اظہار اس پر نہ کیا کیونکہ وہ بہت بھولی بھالی اور شرمیلی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اسے محبت کا مفہوم سمجھانا محال تھا۔

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ موسم کافی تبدیل ہو چکا تھا لیکن کرۂ ارض کا بخار ٹوٹتے ہی انسانوں پر بخار کا حملہ شروع ہو گیا۔ مجھے بھی بخار نے آن دبوچا جس سے کئی دن تک بستر میں پڑا رہا۔ ایک دن صبح جب کہ میرا بخار ٹوٹا اور میں نقاہت سے بستر پر پڑا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی تو گلِ نو کا حسین چہرا اپنے اوپر جھکا ہوا پایا جو کہ کتب آسمانی کی مقدس آیت احسن التقویم کی تفسیر کا کھلا ورق تھا۔ اس کی مست آنکھیں دو نورانی نقطوں کی طرح چمکتی تھیں۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے

دیکھ رہی تھی۔

میری آنکھ کھلتے ہی وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹی اور ناقابلِ بیان خجالت سے تپائی کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ اس کی دلچسپ گھبراہٹ کو میں نے مسکرا کر دیکھا اس نے کپکپاتی ہوئی آواز سے کہا۔

"بے جی نے سکنجبین"۔

اس کی زبان رک گئی اور وہ پورا فقرہ ادا نہ کر سکی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا جو گرا ہی چاہتا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں نے اس کا فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بے جی نے سکنجبین بھیجی ہے۔ لیکن تم کیوں کانپ رہی ہو"۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور گلاس میز پر رکھ کر بھاگ گئی۔

گلِ نو کی اس نظر بازی سے مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن وہ اپنی خاموش محبت کا راز اتفاقاً ظاہر ہو جانے پر بہت خفیف ہوئی اور میرے سامنے آنے سے گریز کرنے لگی۔ اسی شام کو ان تینوں لڑکیوں کا آپس میں کچھ لڑائی جھگڑا ہوا

دوسرے دن میری طبیعت بحال تھی۔ میں آرام چوکی پر بیٹھا کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ بے جی عظیمہ اور متاعوا میرے کمرے میں داخل ہوئیں متاعوا میری مزاج پرسی کرنے لگی اور بے جی میری بکھری ہوئی چیزوں کو درست کرتی رہی۔ اتنے میں گلابہ اور گلقندی بھی آگئیں۔ جن کے پیچھے گلِ نو بھی تھی بے جی عظیمہ

نے ان لڑکیوں کو دیکھ کر کہا۔

"انوار میاں۔ یہ لڑکیاں اپنے دیس جا رہی ہیں اور تمہیں الوداعی سلام لینے کو آئی ہیں"۔

بے جی کے یہ الفاظ زہریلی برچھیوں کی طرح میرے دل میں اُتر گئے میں نے بدحواسی سے کہا۔

"کیوں دیس جانے کی کیا ضرورت ہے"۔

بے جی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ "گلِ نو کا بھائی اُسے لینے آیا ہے کیونکہ اس کی ماں سخت بیمار ہے"۔

میں نے کہا "اس کا بھائی کہاں ہے"۔

مَتا عَوا کہنے لگی "وہ میرے گھر ہے"۔

میں نے کہا "میں تو انہیں نہیں جانے دوں گا۔ میں اپنی چھ ماہ کی محنت جو میں نے اِن لڑکیوں کے واسطے کی ہے ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔

بے جی نے میری بات کاٹ کر کہا "نہیں یہ پھر واپس آ جائیں گی فی الحال ان کا جانا نہایت ضروری ہے"۔

بے جی کے اس فیصلہ پر میں پیچ و تاب کھا کر خاموش رہ گیا۔

یہ لڑکیاں جو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھیں فوراً مَتا عَوا کے ساتھ علی امام کی خانقاہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ بوقتِ رخصت گلِ نو نے مجھے دزدیدہ نگاہوں

سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے لیکن دوسری لڑکیاں خوش تھیں۔

وہ چلی گئی اور میری نگاہیں حسرت و بے چارگی سے دُور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اس کے جانے سے گویا میرے دل کی دنیا ہی اجڑ گئی۔ مجھے اپنی زندگی کے ویران اور آزردہ لمحے گزارنے محال ہو گئے۔ میں دن بھر یکہ و تنہا بستر پہ پڑا رہتا۔ کسی کام کو دل نہ چاہتا تھا۔ اور اکثر کونے والے چوبارے میں جا کر ان لڑکیوں کے کپڑے حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتا جو شاید وہ مجھے تڑپانے کے لئے کھونٹیوں پہ لٹکا گئی تھیں۔

ادھر بے جی کو بھی قدر و عافیت معلوم ہو رہی تھی۔ پورے ڈیڑھ سال تک کام نہ کرنے کی وجہ سے وہ کافی آرام طلب ہو چکی تھی، اس لئے اب گھر کا کام اس سے ختم نہ ہو سکتا تھا۔ غرضیکہ ان لڑکیوں کے جانے سے سارے گھر پر مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔

۳

نومبر کا بے تکا موسم تھا۔ نہ دھوپ اچھی لگتی تھی نہ چھاؤں۔ میں بالاخانے پہ آدھا دھوپ اور آدھا سائے میں آرام کرسی پہ نیم دراز تھا۔ نیچے صحن میں باغ اور عظیمہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ باغ کہتا تھا کہ کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا۔

مجھے جلدی کام پر جانا تھا۔

بے جی کہتی تھی "آخر دیکھ ہی رہے ہو۔ میں کوئی بیٹھی ہوئی تھوڑی ہوں۔ صبح سے برابر لگی ہوئی ہوں۔ مگر کام تو شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس عمر میں کتنا کام کروں۔ خود تو جان چراتے پھرتے ہو۔

اور باغ کہتا تھا۔ "دن اتنے چھوٹے ہو رہے ہیں کہ بمشکل اپنا کام ختم کرتا ہوں۔ اس پر بھی دودھ بلونے میں برابر تمہاری مدد کرتا رہتا ہوں۔ لیکن تم بہت ناشکر گزار ہو"۔

اسی طرح کچھ دیر تو تُو تُو میں میں ہوتی رہی آخر کار بوڑھا اکتا کر اوپر میرے پاس چلا آیا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔

"بابا تم لوگوں کو بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ وہ لڑکیاں کب تک واپس آئیں گی"۔

بڈھے نے کہا "وہ تو سردیاں گزار کر آئیں گی۔ پہلے کیونکر آ سکتی ہیں"۔

میں نے کہا "کیوں"

بڈھا کہنے لگا۔ "ان کا ملک یہاں سے بہت دور ہے۔ جس کے راستے میں برف کے منجمد پہاڑ ہیں اور سردیوں میں وہاں بڑے بڑے برفانی طوفان آیا کرتے ہیں"۔

میں نے پوچھا۔ "پھر بھی یہاں سے کتنے کوس ہوگا"۔

بڈھے نے کہا "کوسوں کا حساب تو خدا ہی جانے۔ وہ تو ہاتھی دھار کے ان بلند اور فلک بوس پہاڑوں سے بھی پرے ہے۔ جو افق کے دھند لکے میں بادلوں کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔"

باغ کے اِن الفاظ پہ مجھے وہ کہانی یاد آگئی جو بچپن میں بے جی سنایا کرتی تھی بے اختیار میرے منہ سے نکلا "وادی کیف"۔

بڈھے نے کہا "کیف کیا"۔

میں نے کہا "وہ وادی جس کے متعلق مجھے بے جی بچپن میں کہانی سنایا کرتی تھی"۔

بڈھا ہنس کر کہنے لگا۔ "واہ بھئی خوب۔ ابھی تک شاید تم بچپن کے خواب ہی دیکھ رہے ہو۔"

اسی اثناء میں بے جی کھانا لے کر آگئی اور گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کھانے کے بعد بوڑھا باغ کام پر چلا گیا۔ بے جی نیچے اُتر گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سردی کا طویل اور منحوس زمانہ اکیلے کس طرح گزاروں گا۔ نہ جانے عالمِ خواب تھا یا بیداری۔ میں نے دیکھا کہ گلِ نو میرے سامنے کچھ فاصلہ پر چپ چاپ کھڑی ہے۔

میں فرطِ حیرت سے اچھل پڑا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "گلِ نو"

اس نے شرمیلی ادا سے کہا "آقا"

میں نے اُٹھ کر دیوانہ وار اُسے گلے سے لگا لیا۔ وہ بھی بے حس و حرکت میرے سینے سے لگی رہی۔ میں نے کہا۔

"تم یہاں کہاں۔ تمہارا وطن تو بہت دُور تھا جس کے راستے میں برفانی طوفان آیا کرتے ہیں۔ پھر تم آجکل کس طرح آن پہنچیں"۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جس طرح سوہنی دریا میں تیر کر اپنے ماہی کے پاس پہنچا کرتی تھی"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے سر اونچا کر کے مجھے دیکھا۔ نگاہوں کا باہم ملنا تھا کہ مجھ پر ایک مدہوشی طاری ہو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں بدستور آرام کرسی پر دراز تھا فضا بالکل خاموش تھی۔ آفتابی پرچم کافی حد تک سرنگوں ہو چکا تھا۔ بے جان اور سرد سائے لمحہ بلحظہ سے زیادہ لمبے لمبے ہو رہے تھے۔

یہ ایک انوکھا خواب ہی نہ تھا بلکہ حیرت انگیز ملاپ بھی تھا۔ اس کے شیریں الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ خواہ یہ خواب تھا یا خیالات کا اثر تاہم مجھے اس ماحول کے بکھر جانے کا بہت ہی افسوس ہوا۔ اور دوبارہ بھی ایسا ہی خواب دیکھنے کی لگن سی لگ گئی۔ اس خواب کو ہفتہ عشرہ ہی گزرا تھا کہ میں دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑا ہا لیمی دھار کے ان بلند اور آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کو حسرت و یاس سے دیکھ رہا تھا۔ جن کے پار گلِ نو

کا ملک بتایا جاتا تھا۔ یکایک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے آنکھ اٹھائی تو گل نوکو دروازے پہ کھڑا پایا۔

وفورِ مسرت سے ایک دبی چیخ میرے منہ سے نکلی۔ وہ دوڑ کر میرے قریب آگئی۔ میں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔

وہ لجاتے ہوئے بولی "کیا کر رہے تھے"

میں نے کہا "میں تمہاری یاد میں ہاتھی دھار کے ان بلند اور آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا جو افق کے دھندلکے میں بادلوں کے سائے سے دکھائی دیتے ہیں"۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ان پہاڑوں کو دیکھنے سے کیا مطلب"۔

میں نے کہا "اس لئے کہ اس کے پیچھے تمہارا وطن ہے"۔

اس نے کہا "مگر میں تو یہیں ہوں۔ پھر اُدھر دیکھنے کا کیا فائدہ"۔

میں نے کہا "مگر تم آئی کیسے ہو"۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے پھر پوچھا "گلابہ اور گلفندی کہاں ہیں"۔

اس نے کہا "گلفندی تو میرے ساتھ ہے لیکن گلابہ سے میری ان ہو گئی تھی اس لئے اُسے وہیں کیف میں چھوڑ آئی ہوں"۔

میں نے بدحواسی سے کہا "وہی کیف جس کے متعلق بے جی بچپن میں مجھے کہانی سُنایا کرتی تھی"۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں رہی کیف"۔

میں نے کہا "مگر وہاں کے باشندے تو اڑنا بھی جانتے ہیں"۔

اس نے کہا "تو میں بھی اڑنا جانتی ہوں"۔

میں نے کہا "اونہہ"۔

اس نے کہا "اچھا دیکھو"۔

وہ نہایت سُرعت سے اُٹھی اور کھڑکی کی کارنس پہ کھڑی ہوگئی۔ میں اسے پکڑنے کے لئے دوڑا مگر اس نے اپنی موٹی موٹی نورانی آنکھوں کے پردے پوری طرح کھول کر مجھے اس طرح دیکھا کہ میں وہیں بت بن کر رہ گیا۔ مجھ پر ایک ایسی پُر لطف کیفیت طاری ہوگئی جیسی کوکین کھانے والے پہ ہوتی ہے اور وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے والی کھلی کھڑکی کے باہر کود گئی۔

اس کے کودتے ہی فوراً میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھبرا کر بستر سے اٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ باہر درخت جھوم رہے تھے اور نیچے ندی کا پانی شور مچا رہا تھا۔ اور بس۔ اس خواب کا میرے دل پہ بہت گہرا اور خاص اثر ہوا۔ محبت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھنے کے علاوہ وادیٔ کیف کا اشتیاق پھر تازہ ہوگیا اور اسی وقت بے جی کے پاس پہنچا جو گھر کے کام میں مصروف تھی۔

میں نے اس سے زبردستی بغل گیر ہوتے ہوئے کہا "بے جی چھوڑ دو اس

کام کو۔"

بے جی مسکرا کر کہنے لگی۔ "میں نہ کروں تو اور کون کرے گا۔"

میں نے کہا "بھاڑ میں جائیں کام، اِدھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

وہ ہنس کر کہنے لگی "تو تمہارے پاس بیٹھ کر کیا کروں۔"

میں نے کہا "مجھے کہانی سناؤ۔"

وہ آہستہ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "جاؤ بھی۔ بڑی بات لے کر آئے۔ میرے پاس فضول باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

میں نے مچلتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں وہ کہانی ضرور سنوں گا۔"

اس نے زچ ہو کر کہا "کون سی کہانی۔"

میں نے کہا "وہی وادی کیف والی۔"

بے جی نے کہا "واہ اتنے تعلیم یافتہ ہو کر ایسی اول جلول کہانیوں کی خواہش کرتے ہو جن کا نہ سر ہے نہ پاؤں۔"

"نہیں نہیں وہ اول جلول نہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے پتہ لگا ہے کہ تم بھی کیف کی رہنے والی ہو۔"

"میں کیف کی رہنے والی ہوں؟" بے جی نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں اور اڑنا بھی جانتی ہو۔" میں نے بدستور دار فتگی سے کہا۔

"اور اڑنا بھی جانتی ہوں" بے جی نے مزید حیرانی سے دوہرایا۔

بے جی سہم کر خاموش ہو گئی مگر میں اپنی دھن میں یہی بات کہتا رہا۔ آخر بے جی اداسی سے کہنے لگی "میرے لال دشمنوں کا دماغ تو نہیں چل گیا۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو"

میں نے چاپلوسی سے کہا "اچھی بے جی مان بھی جاؤ۔ مجھے تو کسی نے یہی کہا ہے۔"

بے جی قدرے خفگی سے کہنے لگی "کس نے تمہیں کہا ہے۔"

میں نے کہا "کسی نے خواب میں کہا ہے۔"

بے جی مجھے پچکارتے ہوئے کہنے لگی "میرے لال خواب خیال ہوتے ہیں۔ خوابوں کا اثر دل پر لینے سے انسان کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔"

میں نے جھلا کر کہا۔ "اگلے دن بابا باغ ہی تو بتلا رہا تھا کہ تم لوگوں کا وطن ہاتھی دھار کے ان آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کے پیچھے ہے جو افق کے دھندلکے میں سائے سے دکھائی دیتے ہیں۔"

اس نے کہا "ہاں بے شک ہمارے وطن ادھر ہی ہے مگر ہمارے وطن کا نام مہاتم ہے کیف نہیں ہے۔"

میں نے اُسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔ "مگر بچپن میں تو تم نے ہمیشہ یہی سنایا کہ ان پہاڑوں کے پیچھے ایک وادی ہے جس کو کیف کہتے ہیں۔"

بے جی کہنے لگی۔ "کہانیاں بھی کبھی سچی ہوئی ہیں۔ وہ تو بچوں کے بہلانے کے

لئے خود گھڑی جاتی ہیں"۔

اس کی خشک گفتگو پر میں بددل ہو کر واپس چلا آیا۔

چند دن بعد کا ذکر ہے۔ ایک روز میں پھر کھلے صحن میں چارپائی پہ پڑا دھوپ سینک رہا تھا۔ دسمبر کا وسط تھا۔ چرخ نیلوفری پر سورج بھی چمک رہا تھا۔ اور ابر کے آوارہ ٹکڑے بھی جا بجا منڈلا رہے تھے۔ جن کے سایوں میں چیلیں کثرت سے اڑ رہی تھیں جیسا کہ عموماً جاڑے کے موسم میں اُڑا کرتی ہیں۔ یہ گروہ در گروہ سوئے آسمان اس طرح دھاوا بول رہی تھیں گویا آسمان کی نیلی راجدھانی کو فتح کرنے جا رہی ہوں یا ساکنانِ فلک سے ہمکنار ہونے کی جستجو میں اپنا خون پانی ایک کر رہی ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے پھر وہی خواہش بے چین کرنے لگی کہ میں بھی ان کے ساتھ اُڑ کر خلا کی نیلی خلائی میں داخل ہو سکوں۔

اتفاقاً اسی وقت چیلوں کا ایک جوڑا اڑتے اڑتے ہوا میں لڑنے لگا اور دونوں گتھم گتھا ہو کر قلابازیاں کھانے لگیں اور فوراً ایک چیل صحن میں آ کر گری مگر گرتے ہوئے اس نے بیٹ جو کی تو وہ سیدھی میرے ہاتھوں پہ آ پڑی۔ میں چیخ اُٹھا اور میں نے غصہ میں آ کر بوٹ اس پہ پھینکا۔

بوٹ کی ضرب کھا کر اس نے زور شور سے چیں چیں کرتے ہوئے دوبارہ اُڑنے کی کوشش کی۔ مگر پھر گر پڑی۔ میں نے دوڑ کر اُسے جا دبوچا۔ اور پاؤں

سے مسلنے لگا۔ چیل ایڑی چوٹی کا زور لگا کر صدائے احتجاج بلند کرنے لگی۔ عین اسی وقت مجھے پیچھے سے کسی نے پکارا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو گلِ نو بصد شان وتجمّل کھڑی تھی۔ میں اُس وقت ٹُک ٹُک دیدم دم نکشیدم کا مصداق بن کر رہ گیا۔ چیل برابر میرے پاؤں کے نیچے مختلف بولیوں میں چیں چیں چاں چاں کرتی ہوئی معافی مانگ رہی تھی۔

گلِ نو میرے قریب آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔ "ایں یہ کیا ظلم کر رہے ہو۔"

میں نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ "اس نے میرے ہاتھ پر بیٹ کی ہے جس کی اسے سزا دے رہا ہوں۔"

اس نے میرا ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو اس بے زبان کو۔ وہ کوئی انسان تو نہیں کہ تم بدلہ لینا چاہتے ہو۔"

خیر میں چارپائی پر واپس آ گیا اور چیل اُڑ گئی لیکن گلِ نو بدستور اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ میں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے آج تم پھر آ گئی ہو۔"

اس نے کہا۔ "ہاں شکر ہے کہ میں وقت پر آ گئی ہوں۔ ورنہ آپ نے تو اُس کمبخت چیل کا خاتمہ کر دیا ہوتا۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب آسمان کو کب تک

دیکھا کرو گی"۔

اس نے چیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو وہ کس قدر وفورِ مسرت سے اُڑ رہی ہیں"۔

میں نے کہا "ہاں آج میں بھی تمہارے آنے سے پیشتر یہی سوچ رہا تھا کہ کاش مجھے بھی اتنی قدرت حاصل ہوتی کہ ان کے ساتھ آسمان کے نیلے پردے پھاڑ کر خوشیوں کی مملکت میں داخل ہو جاتا"۔

اس نے کہا "اونہہ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ ہم بھی آسمانی سڑکوں پر گشت لگا سکتے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ میں بے خود سا ہو گیا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اڑ رہا ہوں حتیٰ کہ میں اڑتے اڑتے بہت اوپر چلا گیا۔ بے حد و حساب رفعتوں سے اونچا بے نشان بلندیوں سے بلند تر۔ تمام دنیا میرے قدموں میں تھی اور میں کافی دیر تک دھواں دھار گھٹاؤں کو چیرتا، برساتی آبگینوں سے ٹکراتا، بھیلے اور ٹھوس بادلوں سے شانہ لڑاتا، محوِ پرواز رہا۔

میری آنکھ کھلی تو بدستور چارپائی پر پڑا تھا۔ گل نو کا بھی کہیں نام و نشان نہ تھا اور نہ ہی یہ یاد تھا کہ آسمان سے زمین پر کیسے اترا۔ البتہ آسمان کی تر و تازہ ہوائیں میرے رونگٹے رونگٹے میں رچی ہوئی تھیں جس سے میری طبیعت میں

بشاشت موجود تھی۔ اس دن سے میں خوابوں کے چکر میں کچھ اس طرح پھنسا کہ گلِ نو کی جدائی بھول کر خوابوں کے نشے میں مست رہنے لگا۔

اسی حالت میں موسم سرما گزر گیا بسنت کے دن شروع ہوئے۔ عروسِ بہار بسنتی گھونگٹ کی آڑ سے جھانکنے لگی۔ بسنتی رنگ کی اس قدر فراوانی تھی جیسے صفحۂ گیتی پر بسنتی رنگ کی بارش ہو رہی ہو یا رنگ ریز قدرت نے جنگلوں کے جنگل اور کھیتوں کے کھیت خوشنما بسنتی رنگ میں ڈبو دیئے تھے شیشوں میں گلابیوں کے عوض بسنتیاں جھلکتی دکھائی دینے لگیں۔ موسم کے تاثرات سے میری طبیعت امنگوں پر تھی۔ میں رات کو پھر خواب دیکھنے کی آرزو دل میں لے کر سو گیا۔

آخرِ شب میں نے خواب میں دیکھا کہ بہت سی لمبی گردنوں والے آبی پرندے میرے کمرے میں گھس آئے ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں اور میں بھی اُن سے کچھ کہہ رہا ہوں۔ پھر دیکھا کہ میں ایک چوڑے صحن میں چھوٹی سی نہر کے کنارے کھڑا ہوں جس میں سفید براق پانی کی ہلکی ہلکی لہریں سنگریزوں کے خوابوں کو توڑتی ہوئی کسی نامعلوم دنیا کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں۔ اس صحن کے ڈھلانی رُخ پر ایک مندر تھا اور داہنے ہاتھ پر کشیدہ قامت پہاڑ۔ جس کی مہیب دراڑوں میں گنیش جی، شو جی اور بھیروں وغیرہ کی مورتیاں پڑی تھیں۔ اسی طرح بائیں جانب بھی دیوارِ کوہ میں ہنومان جی اور بلوان جی کی سیندوری رنگ کی مورتیاں

طاقچوں میں نصب تھیں اور سامنے پہاڑ کی عین آغوش میں ایک خوفناک گپھا تھی۔ اس وقت گلِ نو میرے پہلو میں کھڑی تھی۔ اس کے کپڑوں سے بسنتی رنگ کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے بالوں میں گیندے کے پھول گندھے ہوئے تھے جو صبحِ صادق کی دھیمی روشنی میں نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔

یکایک پھر لمبی گردن والے پرندوں کا غول نمودار ہوا جس نے گلِ نو کو اپنے نرغے میں لے لیا اور پھر پھر کر اُسے ٹھونگیں مارنے لگے۔ وہ اس حملہ سے بچنے کے لئے گپھا کی طرف بھاگی۔ لیکن وہ جانور بھی اس کے تعاقب میں گپھا کے اندر داخل ہوئے۔ اور میں بھی ان کے پیچھے گپھا میں گھس گیا۔

یہ گپھا اندر سے کافی کھلی تھی۔ اس کی چھت کے درمیان ایک خطرناک شگاف تھا۔ جس کے ذریعہ سے ایک زبردست آبشار گپھا کے اندر گرتی تھی اور اُس کی گرجدار آواز گپھا کے اندر ہنگامۂ محشر بپا کر رہی تھی۔ اس آبشار کے گرنے سے گپھا میں چھوٹا سا تالاب بن چکا تھا اور اسی تالاب کا پانی نہر کی صورت میں صحن سے گذر رہا تھا۔ اس تالاب اور نہر کے کناروں پر رنگین پتھر چُنے ہوئے تھے جن کی رنگینیاں پانی کی لہروں کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور مٹتی ہوئی عجیب نظارہ پیش کرتی تھیں۔

گپھا کی قدرتی ہیبت اور ازلی دہشت کو زیادہ نمایاں کرنے میں انسانی

ہاتھ کا بھی بہت کچھ دخل تھا۔ یعنی اُس پہاڑ کی قدرتی اور اصلی ڈاٹ کے نیچے ایک اس سی چھوٹی مصنوعی ڈاٹ بانسوں کی بنی ہوئی تھی جس پر رنگ برنگی جھنڈیوں کے علاوہ کئی عجیب وغریب چیزیں نصب تھیں۔ اندرونی دیواروں پر جا بجا سیندھور کے دھبّے اور کئی قسم کے بے ڈھنگ سے نشان بنائے گئے تھے۔

میں اس تاریک گپھا میں اُسے تلاش کرتا رہا مگر وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ ہر طرف وہی لمبی گردن والے پرندے پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے میں مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ اس کی آواز پر میں آگے بڑھا تو ایک وزنی اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے چھا گیا اور اس کی آواز آبشار کے ہنگامہ ہائے زیر و بم میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر پہ پڑا تھا۔ لیکن سردی سے دانت بج رہے تھے اور جسم تکان سے چور محسوس ہوتا تھا۔ اسی دن بے جی نے ایک پہاڑی لڑکی کام کاج کے واسطے ملازم رکھی جو کہ گل نو وغیرہ کی طرح نئی نئی پہاڑ سے آ کر آجکل مناعوا کے گھر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا نام مغلہ تھا۔

بے جی کا خیال تھا کہ یہ لڑکی بھی پہلی لڑکیوں کی طرح کام کاج میں اسے مدد دے گی مگر مغلہ بہت نکمی اور کام چور ثابت ہوئی۔ اس لئے بہت جلد بے جی کو اس کے خلاف شکایات پیدا ہو گئیں۔ یہ لڑکی تیز و طرار بھی بہت

تھی۔ اسے اپنے آپ پر بڑا ناز تھا۔ وہ ہمیشہ اکڑ کر اور سینے کو بے حد تان کر چلتی تھی۔ اسی لئے بے جی اُسے طنزاً "لقہ کبوتری" کہنے لگی۔ اور وہ لڑکی بجائے شرمندہ ہونے کے "لقہ کبوتری" کے خطاب سے اتنا خوش ہوئی کہ اپنے منہ سے اپنے حسُن کی تعریفیں کرنے لگی۔

اس نے آتے ہی مجھ پہ ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ پہلے پہل تو وہ کچھ خاموش انداز میں ناز و نخرے بگھارتی رہی لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے وہ زیادہ بے باک اور دلیر ہوتی گئی۔ آخر نوبت بہ ایں جا رسید کہ وہ نہایت بے باکانہ عشقیہ گیت گا گا کر اپنی محبت کا اظہار کرنے لگی۔ مگر میں اسے ان حرکتوں پر ہمیشہ جھڑک دیا کرتا۔ اس لڑکی کی شکل تو بُری نہ تھی لیکن آنکھوں سے بے حیائی، گرسنگی اور عیاری ٹپکتی تھی۔ میں اس سے دلی نفرت کرتا تھا۔

اُسے ہمارے گھر میں آئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ بے جی سے اس کی کھٹ پٹ بھی ہوگئی۔ ایک دن میں باہر سے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مغلہ بے جی سے لڑ رہی ہے۔ بے جی نے کہا "یا کام کرو یا گھر سے باہر نکلو"۔

مغلہ نے جواب دیا "نہ تو کام کروں گی اور نہ گھر سے جاؤں گی"۔

باغ نے مغلہ کو پچکارتے ہوئے کہا "چلو جانے دو ایسی باتوں کو۔ جاکر اپنا کام کرو"۔

مغلہ کہنے لگی "تم لوگ کام خود کیوں نہیں کرتے۔ کیا تمہارے ہاتھ ٹوٹے

ہوئے ہیں۔"

باغ نے کہا "اچھا بھلی مانس ہم ہی کام کر لیں گے۔ تم ہمیں معاف کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

وہ بولی "تو تم مجھے نکالنے والے کون ہوتے ہو۔ تم بھی نوکر میں بھی نوکر۔" اس کی زیادتی پر میں نے ڈانٹ ڈپٹ کی۔ مگر بھلا کیسے قابو آ سکتی تھی وہ اس کے جواب میں کوٹھے مٹکا مٹکا کر میری نقلیں اتارنے لگی جس پر بے جی اور بوڑھے باغ نے اسکی بہت بے عزتی کی اور اُسے زبردستی نکالنا چاہا لیکن ان کے دھکیل دھکیل کر نکالنے پر بھی وہ نہ گئی۔

۴

اپریل کا مہینہ تھا۔ بہار کا جوبن کائنات پر چھا چکا تھا۔ پرندوں کے پُر سحر ترانے فضا میں ہل چل مچا رہے تھے۔ اجلے دن چاندنی راتیں اور موسم کی دلفریبیاں سب کچھ میسّر تھا۔ لیکن گلِ نو کے بغیر میرے دل کی نگری سونی تھی۔ میں آزردگی اور بے چارگی سے اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک دن بڈھے باغ نے مجھے گلِ نو اور گلقندی کی آمد کی نویدِ جاں فزا سُنائی۔ جس سے میری پژمردگی اور درماندگی فوراً کافور ہو گئی۔

میں اس سے ملنے کے لئے بے تاب تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ خود ملنے آئیگی

مگر کئی دن گزر گئے وہ ادھر نہ آئی۔ آخر کار میں خود ہی باورچی خانہ والے صحن کی طرف اس سے ملنے گیا۔ مغلہ اس وقت وہاں موجود نہ تھی۔ گلِ نو اور گلقندی دونوں کام میں مصروف تھیں۔ معمولی صاحب سلامت کے سوا انھوں نے کوئی بات نہ کی۔ میں کبیدہ خاطر ہو کر واپس چلا آیا۔ اور اس تاک میں رہنے لگا کہ کہیں وہ اکیلی ملے تو اس بے رخی پر اسے ملامت کروں۔

ایک دن دوپہر کے وقت لڑکیاں نیچے نلکے پر کپڑے دھو رہی تھیں اور میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دھوئے ہوئے کپڑے بالٹی میں ڈال کر حویلی میں داخل ہوئی۔ میں باہر صحن میں نکل آیا اور دیکھنے لگا کہ وہ کہاں جائے گی۔ دفعتاً مجھے باورچی خانہ کی چھت پر گلِ نو دکھائی دی۔ میں اپنے صحن کی طرف سے اوپر چلا گیا۔ کیونکہ سب حصوں کے بالاخانے آپس میں ملتے تھے۔

گلِ نو دھوپ میں کپڑے پھیلا رہی تھی۔ میں نے پیچھے سے جا کر اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے میرے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے خفگی سے کہا۔ "مغلہ کمبخت میں نے تمہیں کئی دفعہ منع کیا ہے کہ مجھے نہ چھیڑا کرو۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مغلہ کو کیوں کوستی ہو۔ دیکھ تو لو کون ہے۔"

میری آواز پر وہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔

"ہائیں یہاں کیوں آئے" اس نے بدحواسی سے کہا۔

"تم سے ملنے کے لئے" میں نے جواب دیا۔

"مجھ سے ملنے کے لئے"۔ اس نے اداسی سے پوچھا۔

"ہاں تم سے ملنے کے لئے" میں نے کہا۔ "میں کئی دن تک تمہارا انتظار کرتا رہا اور تم نہ آئیں۔ تو میں خود تمہارے پاس چلا آیا تاکہ تم سے ناراضی کی وجہ دریافت کروں"۔

وہ روکھی پھیکی ہو کر بولی "بھلا میں کیوں آپ کے پاس آتی میرا آپ سے کیا واسطہ"۔

میں نے کہا "اگر واسطہ نہ تھا تو پھر خوابوں میں کیوں ملنے آتی تھیں"۔

اس نے کہا "کیسے خواب"۔

میں نے وہ تمام عجیب و غریب خواب جو اس کے متعلق آج تک دیکھے تھے دوہرائے۔ جوں جوں میں اسے خواب سناتا گیا۔ توں توں اس کے چہرے کا رنگ اڑتا رہا۔ خاتمہ پر اس نے کہا "واہ بھلا خوابوں کی بھی کچھ حقیقت ہوتی ہے"

"مگر میں تو اب ان خوابوں کو سچا کر کے دکھاؤں گا"۔ میں نے کہا۔

"وہ کیسے" اس نے کہا۔

"تمہارے ساتھ شادی کر کے" میں نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں آپ ایسا نہ کہیں"۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "آپ آقا ہیں اور میں ایک معمولی خادمہ۔ آپ کو اپنے رتبہ کا خیال رکھنا چاہئے"۔

میں نے کہا۔ "اچھا ناصح نہ بنو اور میرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔"

اس نے اکتا کر کہا۔ "اگر آپ مجھے تنگ کریں گے تو میں آپ کے گھر سے چلی جاؤں گی۔"

میں نے آزردگی سے کہا۔ "اچھا ایک بات بتا دو۔"

اس نے پوچھا "کیا۔"

میں نے کہا "تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو یا کہ میں صرف غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔"

اس نے میری بات کا کچھ جواب نہ دیا اور چپ چاپ کھڑی ہوئی کچھ سوچتی رہی۔ پھر یکایک اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ عین اسی وقت مغلہ نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں رقابت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ شاید وہ تمام باتیں سُن چکی تھی۔

اُسے دیکھ کر گلِ تو نیچے اُتر گئی اور مغلہ میری طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا ہلا کر کہنے لگی۔ "ہوں یہ بات ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بولی۔

"کیوں جی وہ مجھ سے اچھی ہے۔"

میں نے غصّہ سے کہا۔ "ہاں۔"

اس نے کہا "تو اس کے کون سے لعل ٹکے ہیں۔"

میں نے اُسے سختی سے روکنا چاہا مگر وہ باز نہ آئی۔ بلکہ میری طرف آنکھوں اور انگلیوں سے اشارے کر کے ماہیا گانے لگی۔ اس کی اس حرکت سے تنگ آ کر میں نیچے چلا آیا۔

یہ جان کر کہ گلِ نو بھی مجھ سے محبت کرتی ہے مجھے اطمینان ہو گیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مجھ سے اتنی بیگانہ کیوں ہے۔ شاید مُغلہ نے اُسے بدظن کر رکھا تھا کیونکہ مُغلہ سے اس کی بہت رفاقت تھی۔

اس دن کے بعد پھر کبھی گلِ نو سے مجھے تنہا ملنے کا موقع نہ مل سکا۔ مُغلہ نے اُسے ایسا ہتھے چڑھایا کہ وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگی۔ مُغلہ کی کئی پہاڑی سہیلیاں جو اکثر اس سے ملنے آیا کرتی تھیں، گلِ نو کی بھی سہیلیاں بن گئیں اور اکثر وہ لڑکیاں اسے اپنے ڈیرے پر لے جاتیں جہاں سے وہ دو دو دن تک واپس نہ آتی۔ گو بے جی کو گلِ نو کی یہ حرکت بہت ناگوار گزرتی تھی تاہم عقلمندی کے لحاظ سے اس پر زیادہ سختی نہ کرتی تھی کیونکہ عقلمندی اس کی غیر حاضری میں اس کا سارا کام خود کر دیا کرتی۔ پھر بھی بے جی نے اُسے کئی دفعہ ٹوکا مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ایک دن میں باغ میں بیٹھا لگان کے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ دور ریٹھے کے گھنگھریلے درخت میں جھولا پڑا تھا اور پہاڑی لڑکیوں کا ایک پرے کا پرا جھولے کے گرد جھرمٹ لگائے کھڑا تھا۔ اور یہ لڑکیاں باری باری جھول رہی

تھیں۔ یہ لڑکیاں بالکل پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھیں مگر حُسن ایسا خیرہ کُن تھا کہ چہرے پہ آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ انہوں نے ریٹھے کا چھلکا مل کر ہونٹ رنگین کر رکھے تھے جن کے اندر سے دانت تراشے ہوئے ہیروں کی طرح چمکتے تھے۔ گلِ نو ان لڑکیوں کے درمیان ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔

مجھے یہ نظارا بہت بھلا معلوم ہُوا۔ میں کام چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور تھوڑی دور پر انگور کی بیلوں کی آڑ سے یہ چہل پہل دیکھنے لگا۔ اتفاقاً کہیں چپل چشم مغلہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ فوراً الھڑ کبوتر کی چال چلتی ہوئی میرے پاس آ موجود ہوئی۔ اور کہنے لگی "چھپ چھپ کر کیا دیکھتے ہو۔ مجھ جیسی تو ان میں ایک بھی نہیں"

میں نے اُسے کڑے تیوروں سے دیکھا تو وہ زیادہ بپھر کر کہنے لگی "اچھا اگر بدلہ نہ لیا تو مغلہ نام نہیں"۔

یہ کہتے ہوئے وہ چٹکیاں بجا کر ناچنے لگی۔

گلِ نو کی آوارگی پر میں دل میں بہت کڑھتا تھا اور اُسے اس حرکت سے روکنا چاہتا تھا چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں ایک دن باورچی خانہ کی طرف گیا کیونکہ آج جمعرات کا دن تھا۔ بے جی اور بوڑھا باغ علی آغا امام کی خانقاہ پر جا چکے تھے اس لئے آج موقع تھا لیکن باورچی خانہ میں جا کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کیونکہ گلقندی وہاں اکیلی کام کر رہی تھی۔ گلِ نو، مغلہ اور اس کی سہیلیوں

کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی ۔ میں نے اس سے گلِ نو کی شکایت کی۔ گلقندی کہنے لگی "گلِ نو کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ مغلہ زبردستی اُسے ساتھ لے جاتی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا اب مغلہ کی ضرور خبر لوں گا۔ جس وقت وہ واپس آئیں مجھے خبر دینا۔"

دوسرے دن گلقندی نے بتایا کہ وہ آ رہی ہیں۔ میں ان کے راستے میں پھاٹک پر جا کھڑا ہوا۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی لڑکیاں تھیں جو مجھے پھاٹک پر کھڑا دیکھ کر بھاگ گئیں مگر مغلہ اور گلِ نو سیدھی چلی آئیں۔ گلِ نو تو مجرم کی طرح ڈری اور سہمی ہوئی آ رہی تھی لیکن مغلہ نہایت بے خطر طرارے بھرتی ہوئی۔

"کیوں جی اتنے برہم کیوں ہو رہے ہو۔" اس نے آتے ہی مٹک کر کہا۔

میں نے کہا "بکو مت۔"

وہ میرا منہ چڑانے لگی۔ میں اس کی بدعنوانیوں کو نظر انداز کر کے گلِ نو کو ملامت کرنے لگا۔ وہ ڈر سے کانپ رہی تھی مگر مغلہ بگڑ کر بولی

"وہ خود نہیں گئی۔ میں اس کو لے گئی تھی اور آئندہ بھی جہاں چاہوں گی لے جاؤں گی۔ آپ روکنے والے کون ہیں۔"

میں نے جھلا کر کہا۔ "اچھا آئندہ ذرا ساتھ لے جانا۔ تمہیں گولی نہ ماردوں تو میرا نام نہیں۔"

اس جواب پر وہ قہقہہ مار کر ہنسی اور تال لیتے ہوئے ٹپے گانے لگی۔

اس کی اس قدر بڑھی ہوئی جسارت پر میں آگ بگولہ ہو گیا اور چوٹی سے پکڑ کر اسے اتنا مارا کہ پلپیتھن نکال کر رکھ دیا۔ اگر بوڑھا باغ بیچ بچاؤ نہ کرتا تو شاید وہ زندہ نہ بچتی۔ میرے ہاتھ سے چھٹتے ہی وہ چیختی چلاتی اور بد دعائیں دیتی ہوئی ہمارے گھر سے چلی گئی۔

مغلہ کے چلے جانے پر کچھ دن تو امن و اماں سے گزر گئے۔ مگر ایک دن شام کو پھر مجھے اطلاع ملی کہ گلِ نو غائب ہے۔ صبح مغلہ کی ایک سہیلی اس سے ملنے آئی تھی جو اس سے کچھ سرگوشیاں کرتی رہی جس پر گلِ نو چپکے سے اس کے ساتھ چلی گئی اور ابھی تک واپس نہیں آئی

میں نے پوچھا "مغلہ آج کل کہاں رہتی ہے۔"

گلقندی نے کہا۔ "نلنی نامی ایک ہندو لڑکی اس کی سہیلی ہے وہ اس کے گھر رہتی ہے۔"

میں نے کہا "اچھا صبح مجھے نلنی کا گھر دکھانا۔"

دوسرے دن میں صبح سویرے ہی گلقندی کے ہمراہ نلنی کے گھر گیا اور چلتے وقت میں نے مغلہ کو ڈرانے کے واسطے بندوق بھی ہاتھ میں لے لی۔ نلنی چھوٹے سے ناک نقشہ والی ایک پہاڑی لڑکی تھی۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے باغیچہ میں پانی دے رہی تھی۔ گلقندی نے اس سے

منگلہ کی بابت پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ وہ گل نمہ اور اپنی دوسری سہیلیوں کے ساتھ کہیں گئی ہے۔ گلقندی نے کہا۔

"آج تم ان کے ساتھ نہیں گئیں۔"

اس نے کہا "میں نے برت رکھا تھا۔"

گلقندی نے کہا "پھر بھی تمہیں پتہ تو ہوگا کہ وہ کہاں گئی ہیں۔"

نلنی کہنے لگی "وہ کچھ بتا کر تو نہیں گئیں مگر دھار کے سوا اور کہاں جائیں گی۔"

نلنی کے گھر سے نکل کر ہم دونوں دھار کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی پختہ اور خام سڑکیں طے کرنے کے بعد پھر وہی ویران اور شکستہ راستہ شروع ہوا جس پر سے پہلی مرتبہ گزر کر میں بے جی کو منانے کے لئے علی آمام کی خانقاہ پر جا چکا تھا اور انہی پیچ و خم کھاتی ہوئی سیڑھیوں کے اختتام پر گلقندی نے سیدھا اس ظلماتی مندر کا رخ کیا۔ میں نے تعجب سے کہا۔

"گلقندی کہاں جا رہی ہو۔"

اس نے جواب دیا "دھار پر۔"

میں نے کہا "مگر بوڑھا باغ تو اس کو اچھرہ کنڈ کہتا تھا۔"

گلقندی کہنے لگی "ہاں اس کا اصلی نام تو اچھرہ کنڈ ہے مگر عوام اس کو دھار ہی کہتے ہیں۔"

خیر ہم لوگ اُس وحشت خیز مندر میں داخل ہوئے جہاں اندر قدم رکھتے ہی میں ششدر رہ گیا اور پاگلوں کی طرح ہر ایک چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کیونکہ یہ وہی جگہ تھی جہاں بسنت کے موقع پر میں خواب میں بھی آ چکا تھا۔ وہی بلند پہاڑ کی دراڑوں میں بُت کدہ۔ وہی دیوارِ گڑا اور سیندھور آلود مورتیاں۔ وہی پہاڑ کی آغوش میں مہیب گپھا۔ وہی زیر و بم کرتی ہوئی ہنگامی آبشار۔ وہی اس خوفناک منظر کو ابھارنے والی انسانی کاریگریاں۔ وہی کھلا صحن اور اس میں بہتی ہوئی چھوٹی سی نہر۔ غرضیکہ یہ سب نقشہ ہو بہو اس خواب والا تھا۔ صرف گلِ نو کی کمی تھی۔

اس وقت گذشتہ خواب کے نقوش متواتر پردۂ ذہن پر ابھر رہے تھے اور میں اس گپھا میں بے حس و حرکت کھڑا آبشار کی گھن گرج سُن رہا تھا اچانک آبشار میں سے ایک نقرئی قہقہے کی گونج پیدا ہوئی جیسے کسی دوسری دنیا سے آ رہی ہو۔ میں چونکا۔ گلقندی نے کہا۔ "وہ یہیں ہیں ادھر۔"

میں گھبرایا ہوا گپھا کی تاریک اور مدور چھت کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس میں بڑی بڑی خطرناک چٹانیں بڑ کی داڑھیوں کی طرح لٹک رہی تھیں اور درمیان میں آبشار والا شگاف اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی کالی بلا منہ پھاڑے کھڑی ہو اور اس کے دہن سے جھاگ نکل رہا ہو۔ میں نے کہا

"یہ تو اچھا خاصا نظر بندی کا کھیل ہے۔ انسان تو کہیں کچھ بھی دکھائی دیتا۔

شاید یہ آبشار ہنس رہی ہے۔"

گلقندی کہنے لگی "واہ آبشاریں بھی کہیں ہنسا کرتی ہیں۔ وہ تو لڑکیاں اوپر آبشار کے بیرونی دہانے پر کھڑی ہنس رہی ہیں۔ اندر سے آپ کو کیسے دکھائی دیں گی۔"

اب میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ باہر پہاڑ کے اوپر عین چوٹی پر آبشار والے شگاف کے کنارے کھڑی ہیں۔ اتنے میں مغلّہ کی آواز آبشار کی لہروں پر بہتی ہوئی سنائی دی۔

"آؤ اس شگاف سے نیچے کود دیں۔"

اس کے جواب میں کسی نے کہا۔

"بہت اچھا۔"

یہ الفاظ سن کر میں کانپ اٹھا کیونکہ اتنی خطرناک بلندی سے کودنے کا نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ لہٰذا میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی بندوق فوراً ایک لٹکتی ہوئی چٹان پر داغ دی تاکہ اس کی آواز سے لڑکیاں خوف زدہ ہو کر دہانے سے ہٹ جائیں۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا بندوق کی آواز کے ساتھ ہی ایک دردناک چیخ کے ساتھ کوئی چیز نیچے آبشار میں دھم سے گری اور ساتھ ہی دہانے پر بھی کہرام مچ گیا۔ جسے سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں دم بخود کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پھر فوراً ہی مسلسل

ہُوا کہ اوپر والی لڑکیاں بھاگ رہی ہیں کیونکہ ان کی چیخیں دم بدم دُور ہوتی جا رہی تھیں۔

ادھر عین موقع پر مندر کا منحنی سا پجاری "ہر ہر" کرتا ہُوا پہنچ گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو آبشار کا کنارا لہُولہان ہو رہا تھا اور گلقندی ایک لمبی گردن والے زخمی کلنگ کو اُٹھائے پانی میں کھڑی رو رہی تھی۔ دراصل یہ بھاری بھرکم آبی پرندہ نہ جانے کہاں کالی لٹکتی ہوئی چٹانوں کی کھوہ میں چھپا بیٹھا تھا جو میری بندوق کا نشانہ بن گیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی اور وہ گلقندی کی گود میں بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

پجاری خون خون کہہ کر بھاگتا ہُوا باہر نکل گیا۔ شاید مجھے گرفتار کرنے کے لئے کسی مددگار کو بلانے گیا تھا۔ کیونکہ میں نے مندر میں جیو ہتیا کی تھی۔ میں نے اس کے ارادے کو بھانپ کر گلقندی سے کہا۔ "چلو بھاگ چلیں ورنہ پجاری ہمیں پکڑا دے گا۔"

اس نے جواب دیا۔ "آپ بے شک بھاگ جائیں مگر میں اس زخمی کلنگ کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔"

میں مجبور ہو گیا لیکن فوراً مجھے ایک تدبیر سوجھی۔ میں نے منت کرتے ہوئے کہا "کلنگ کو بھی ساتھ ہی اُٹھا کر لے چلو۔ راستے میں مَیں بھی تمہارا ہاتھ بٹاتا رہوں گا۔"

گلقندی مان گئی۔ اس نے کلنگ کو اپنی اوڑھنی سے ڈھانپ کر اٹھا لیا اور میرے ساتھ ہو لی۔ اس طرح ہم دونوں وہاں سے بھاگے۔ راستے میں اس زخمی بوجھ کو کبھی میں اٹھاتا اور کبھی گلقندی۔ غرضیکہ ہم لوگ گرتے پڑتے اس حد سے باہر نکل آئے۔

بے جی اور بوڑھا باغ اس کلنگ کو دیکھ کر بہت آزردہ ہوئے۔ باغ نے فوراً اس کا زخم صاف کیا اور اس پر تمباکو کا جلا ہوا گل رکھ کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ پھر لحاف میں لپیٹ کر اُسے چارپائی پر رکھا اور آگ جلا کر حرارت پہنچانے لگا۔ ان کوششوں سے کلنگ کی حالت کچھ سنبھل گئی۔

اس واقعہ کے بعد گلِ نو یا دوسری کوئی پہاڑی لڑکی ہمارے گھر کی طرف نہ پھٹکی۔ گلقندی گھر میں اکیلی رہ گئی جو وقتاً فوقتاً میری دلجوئی کیا کرتی۔ حالانکہ اُسے خود اس بات کا بہت افسوس تھا کہ گلِ نو نے اُسے پردیس میں اکیلا چھوڑ دیا تھا مگر ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار وہ صرف مجھ کو ٹھہراتی جس نے رقابت کی وجہ سے گلِ نو کو ورغلایا تھا۔

آج کل گلقندی کی تمام تر توجہات کا مرکز وہ زخمی کلنگ تھا۔ جو ابھی تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ بے جی نے گلقندی کو صرف کلنگ کی تیمارداری کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ بے جی خود بھی کلنگ کی بہت خدمت کرتی اور اس کے لئے اکثر غمگین رہا کرتی۔

ایک دن میں اتفاقاً باورچی خانہ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بے جی اور گلقندی چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھی ہیں اور کلنگ اُن دونوں کے درمیان بیٹھا ہے۔ بے جی اور گلقندی دونوں کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ وہ کلنگ کے جسم پر ہاتھ پھیرتی ہوئی نہایت پُردرد لے میں گا رہی تھیں

کونجے نی پہاڑ دیئے کدی کر وطناں دل پھیرا۔

ان کے آنسو اس طرح چھما چھم کلنگ کے منہ پر گرتے تھے کہ کلنگ بھی روتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میرے خیال میں تو شاید کلنگ سچ مچ رو رہا تھا

اس دردناک منظر سے میں بہت متاثر ہوا اور میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اسی وقت بوڑھا باغ ایک کبوتر باز کو ساتھ لئے گھبرایا ہوا داخل ہوا۔ آج شاید اس کلنگ کی حالت زیادہ خراب تھی۔ کبوتر باز کو اس کے علاج کے لئے لایا گیا تھا کیونکہ یہ پرندوں کے معالج سمجھے جاتے ہیں۔

اس کبوتر باز کا نام وساؤ تھا۔ اس نے کلنگ کا زخم دیکھ کر کہا "زخم تو کافی گہرا ہے لیکن گوشت میں چونکہ چھرا نہیں ہے اس لئے امید ہے کہ اگر باقاعدہ علاج کیا جائے تو یہ بچ سکتا ہے۔

خیر وساؤ کا علاج شروع ہوا اور کلنگ کی زندگی بھی باقی تھی یا وساؤ کی دواؤں کا اثر تھا، کلنگ رفتہ رفتہ اچھا ہونے لگا اور دو مہینے کے مسلسل علاج سے وہ بالکل صحت یاب ہو گیا۔ اسکی صحت یابی سے سب کو خوشی ہوئی

اکتوبر کا مہینہ تھا۔ زمین کو آتشیں بادِ بہار کچھ عرصہ کے واسطے خاموش ہونے والا تھا۔ کھولتی ہوئی دھوپ اپنی آخری قوتیں ختم کر چکی تھیں۔ میں گلِ نو کی طرف سے مایوس ہوا۔ اپنے کمرے میں پڑا بدقسمتی کو رو رہا تھا کہ گلقندی اندر داخل ہوئی اور مجھے غمگین دیکھ کر کہنے لگی۔

"آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنے وطن جا رہی ہوں اور انشاءاللہ موسم بہار شروع ہوتے ہی اُسے ساتھ لے کر آؤں گی۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ دوسری صبح اپنے وطن روانہ ہونے والی ہے۔ غرضیکہ وہ الوداعی سلام کہہ کر باورچی خانہ کی طرف چلی گئی اور میں پلنگ کے جنگلے پر جھکا ہوا اپنی بے مصرف اور روکھی پھیکی زندگی پر غور کرنے لگا۔

مجھ پر شاید اس حالت میں غنودگی طاری ہو گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ گلِ نو دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی ہے۔ میرے بار بار پکارنے پر وہ سہمی ہوئی اندر آئی اور اپنی غلطیوں پر معافی مانگنے لگی۔ اس کی صورت کچھ پژمردہ سی ہو رہی تھی اور اس کا خوش رنگ گلابی چہرا ماند پڑ رہا تھا۔ اس کی زبوں حالی پر میں تڑپ گیا اور نہایت محبت سے اُسے گلے لگا لیا۔ اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو میری قسم ہے ملول نہ رہنا۔ میں جلد ہی آپ کے پاس آ جاؤں گی۔"

میں کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر دیکھا، نہ جانے مجھے کیا ہُوا۔ میری آنکھوں کے سامنے جالا سا تن گیا اور وہ منظر دھندلا کر غائب ہو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو میں بدستور پلنگ کے جنگلے پر جھکا ہُوا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور لرزتی ہوئی ہوائیں شبنم کی بوچھاڑ کر رہی تھیں۔

صبح میں بیدار ہُوا تو بجائے گلفندی کے وساڈ کبوتر بانہ چائے لئے کھڑا تھا میں نے تعجب سے کہا۔ "اوہ، آج تم چائے لے کر آئے ہو"

اس نے کہا۔ "حضور بے جی نے مجھے خدمت کے لئے کہا ہے کیونکہ گلفندی اپنے وطن چلی گئی ہے"۔

میں نے کہا۔ "ہائیں اتنے سویرے چلی گئی"۔

وساڈ کہنے لگا۔ "جی ہاں اور کلنگ کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے"۔

"کیا کلنگ کو بھی لے گئی ہے" میں نے تعجب سے کہا۔

وساڈ نے کہا۔ "میں نے تو حضور اسے منع بھی کیا تھا۔ مگر بے جی اور بابا نے مجھے جھڑک دیا"۔

میں نے کہا "یہ اس نے بڑی غلطی کی"۔

وساڈ کہنے لگا "حضور لڑکیاں بڑی احمق ہوتی ہیں"۔

وساڈ چلا گیا مگر دیر تک اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے کہ لڑکیاں بڑی احمق ہوتی ہیں۔ واقعی گلفندی بڑی احمق ثابت ہوئی وہ کلنگ کو اٹھا کر

راستہ کس طرح طے کرے گی۔

5

اس خلفشار اور بے چینی کے عالم میں پل پل اور گھڑی گھڑی گنتے ہوئے موسم سرما بھی گزر گیا۔ موسم بہار کی ابتدا تھی۔ کہنہ سال اور خستہ حال دھرتی نئے سرے سے پھر جوانی کے خواب دیکھنے لگی۔ سبزے کی شادابی اور گل بوٹوں کی دلفریبیاں آشکارا ہو رہی تھیں۔ خزاں رسیدہ درخت اپنا حُسن و تازگی واپس لے رہے تھے۔ ندیوں کی کوثریں موجوں میں سوئی ہوئی موسیقیت بیدار ہوتی جاتی تھی۔ پرندے اپنی کھوئی ہوئی خوشنمائی اور چلبلاہٹ دوبارہ حاصل کر رہے تھے۔ ہواؤں میں نرماہٹ اور شیرینیت پیدا ہو چکی تھی۔ غرضیکہ زمین و آسماں کی ہر شئے مسکرا کر گلِ نو کی آمد کا پیغام سُنا رہی تھی اور میں بہار کی قافلے کے انتظار میں چشم براہ تھا۔

آخر ایک صبح جب دساؤ چاء لے کر آیا تو کہنے لگا۔

"آج صبح منہ اندھیرے ہی گلشنہ بی بی جی کے پاس آئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "جاؤ اُسے میرے پاس بلا لاؤ۔"

دساؤ کہنے لگا "مگر وہ تو اسی وقت واپس چلی گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس کے ساتھ کون تھا؟"

اس نے کہا "وہ اکیلی تھی"۔

میں نے اسی وقت بے جی سے جا کر دریافت کیا۔ بے جی نے کہا۔
"وساؤ کو شاید دھوکا ہوا ہے۔ وہ لڑکی گلفندی نہ تھی بلکہ متاغوا کی چھوٹی بہن تھی"۔

یہ سن کر میں بجھے ہوئے دل سے واپس چلا آیا اور تمام دن میں نے ایک تلخ کشمکش میں کاٹ دیا۔ اسی رات میں نے پھر ایک خواب دیکھا جس کی تلخ یاد کبھی فراموش نہیں ہو سکتی اور جس کے بیان سے بھی میرے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور بے جی دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔
"گل نو کی چٹھی آئی ہے۔ ذرا مجھے پڑھ کر سناؤ"۔

میں وہ چٹھی پڑھنے لگا۔ یہ چند بے مطلب اور بے جوڑ فقرے تھے۔ خط کی عبارت میری سمجھ میں نہ آئی۔ مگر میں اسے پڑھتا ہی رہا۔ ایک بار، دوسری بار، تیسری بار میں نے وہ الفاظ دوہرائے۔

تیسری مرتبہ دوہراتے ہی میرے جسم میں گویا ایک ایٹم بم سا چھوٹا اور مجھے اپنے بدن کے مسام کھلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جن کے ذریعہ ہوا میرے اندر بھرنے لگی۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکلا۔ تبسم ریز صبح چاند کے [illegible] پھول

کرتی ہوئی نئے دن کی آمد کا پیغام دے رہی تھی اور نسیم صبح رنگ و بو لٹا رہی تھی۔ اس کی نرم اور معطّر لہروں کے ساتھ ساتھ میں بھی زمین سے اونچا اُٹھنے لگا اور رفتہ رفتہ بلند ہوتے ہوتے بے شمار فضائی منزلیں طے کر گیا۔ انسانی تخیّل سے دور۔ تصوّرات کی دنیا سے پرے۔ آسمانی بادشاہت کی مقدس حدود کے اندر۔ فلک کے بے کنار پھیلاؤ میں۔ نیلی ہواؤں کی منہ زور لہروں کے دوش پر سوار ان پہاڑوں کی طرف جا رہا تھا جو افق کے دھندلکے میں بادلوں کے سائے سے دکھائی دیتے تھے۔

میرے سوا اور بھی دو بڑے بڑے جسیم پرندے تھے جو میرے دائیں بائیں اُڑ رہے تھے۔ نہ جانے میرے جانے کا کیا مقصد تھا۔ غرضیکہ اسی طرح اُڑتے اُڑتے میں نے کئی شامیں، کئی صبحیں اور کئی دن راستے میں گزار دئے۔ کبھی شفق کی رنگینیوں سے ہولیاں کھیلیں۔ کبھی ملائکہ مقرّبین کے حضور میں فنِ پرواز کے جوہر دکھائے۔ راستے میں بڑے بڑے سیلاب آور دریا، تیرہ و تار جنگل لق و دق میدان اور ریتلے بیابان دیکھے۔ کوہِ آتش فشاں اور برف سے منجمد پہاڑ عبور کئے۔ غرضیکہ اسی طرح موجوداتِ ارضی کو روندتا ہُوا ایک دن ایک ایسے پہاڑ کے قریب پہنچا جس کی چوٹیاں میری پرواز سے بھی بلند اور عظیم تھیں گویا آسمان کے شکم میں گھسی ہوئی ہوں۔

یہ ٹھوس اور مستحکم چوٹیاں گردشِ لیل و نہار سے مطلق بے خبر اور بادِ تغیر

سے بالکل بے نیاز تھیں جن کو میں دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے جسم کے سہارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس مقام پر میرے ہمراہی پرندوں میں سے ایک کا دم اکھڑ گیا۔ وہ پھڑپھڑاتا ہوا چٹانوں پر گرا۔ اُسے دیکھ کر دوسرا پرندہ بھی بیٹھ گیا۔ میں بھی رکا۔ تندرست پرندے نے چٹانوں کی درزوں میں سے کچھ پیس دار سی چیز نکال نکال کر بیمار پرندے کی چونچ میں ڈالی جس کے اثر سے کچھ دیر بعد وہ بیمار پرندہ بالکل تازہ دم ہو گیا اور ہم تینوں پھر اُن ٹھوس اور وحشی پہاڑوں کی اثر دہا صفت چوٹیوں تک پہنچنے کے لئے اڑنے لگے۔

اس سے اوپر ہوا نہایت لطیف تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا پروں کو جنبش دینا دشوار تھا۔ پروں کے پھیلاؤ اور سکڑاؤ کی پیہم رگڑ سے چنگاریاں پھوٹتی تھیں۔ یہاں طاقت بیکار تھی۔ انتہائی زور لگا کر نڈھال ہو رہے تھے لیکن تھکن سے چور ہونے کے باوجود ہم اس کٹھن اور حوصلہ شکن راستے کو طے کرنے کے درپے تھے۔ آخرکار غروبِ آفتاب کے قریب ہم اُن شوریدہ سر اور ناقابلِ تسخیر برفیلی چوٹیوں تک جا ہی پہنچے۔

سورج اگرچہ اس وقت کسی ماہر غوّاص کی طرح بحرِ مغرب میں غوطہ زن ہونے والا تھا پھر بھی برف کے ڈل دار تودوں پر اسکی ہر ادنیٰ کرن بذاتِ خود سورج بن کر چمک رہی تھی۔ یہاں اس وقت روشنی اس قدر تیز اور چمک اتنی سخت تھی کہ میری بینائی یک لخت زائل ہو گئی۔ اب میں اپنے ہمراہی پرندوں کی مدد سے

نیم پرواز اور نیم پیادہ حالت میں پہاڑ کی دوسری طرف اُتر گیا۔

آخر ایک لمبی اور کڑی منزل طے کرنے کے بعد ہم ایسی جگہ جا پہنچے۔ جہاں ہماری سانس پھر برقرار ہوگئی۔ اس مقام پر میں سو گیا یا بے ہوش ہوگیا۔ اسی وقت میری آنکھوں میں سخت ٹیس ہوئی۔ اور یوں معلوم ہوا۔ جیسے کوئی آنکھوں میں سلائیاں سی پھیر رہا ہو۔ میں نے آنکھ کھولی تو مجھے سب کچھ نظر آرہا تھا اور میرے ہمراہی پرندے میری گردن کو اپنی لمبی اور مضبوط چونچوں سے دبائے میری آنکھیں کسی پودے کی جڑوں سے رگڑ رہے تھے۔ اس کے بعد ہم پھر اڑنے لگے

اب ہم ایک عجیب و غریب خطۂ ارض پر اڑ رہے تھے جو دنیا سے بالکل الگ، تھلگ اور انوکھا تھا۔ تہذیب و تمدن سے اسے دور کا واسطہ نہ تھا۔ یہ ایک رومان پرور وادی تھی۔ اس کے ارد گرد عظیم الہیئت اور رفیع الشان پہاڑ تھے جنہیں زرگرِ قدرت نے خالص سونے اور چاندی سے ڈھالا تھا اور جن کی حیران کن چوٹیوں پر جمی ہوئی شفاف بلوریں برف نیچے سے دیکھنے پر نور کا ہالہ سا دکھائی دیتی تھی۔

اس سرزمین پر مٹی کے ذروں کی بجائے ابرق کا برادہ پھیلا ہوا تھا جو اپنی ہفت رنگی چمک دمک سے وادی کی شان کو دوبالا کر رہا تھا گویا ننھے منے آسمانی ستارے ذروں میں تبدیل ہو کر اس سرزمین پر چھا رہے ہوں اور اس

ابرق کے برادہ میں گھلی ملی موتی چور ندیاں قوسِ قزحی شعاعیں بکھیرتی اور کومل سروں میں گاتی ہوئی بہہ رہی تھیں۔

اِدھر اُدھر جا بجا فیروزہ، عقیق، نیلم، پکھراج، زمرّد اور ہیرے کی چٹانیں تھیں۔ خود رو چمن اور باغات کثرت سے تھے۔ پھول غیر معمولی طور پر خوشنما اور زیادہ گہرے رنگوں والے تھے جن کے حاشیے طلائی اور نقرئی جھلک مارتے تھے اور پنکھڑیاں سچے موتیوں کی سی آب و تاب دکھاتی تھیں۔ یہاں کا سبزہ نہایت آبدار اور درختوں کی رنگت زیادہ تیز تھی۔ پھلوں میں بھی وہی چمکیلا پن تھا۔ یہاں کے جانور بھی ہلکے یا گہرے چمکدار رنگوں کے تھے جیسے کہ ہر یک دانہ سے بنائے گئے ہوں۔ ان میں بعض کی منقاریں طلائی تھیں اور بعض کی نقرئی۔ اس بہشت نظیر وادی کی خوش منظری سے میں بے حد محظوظ ہوا اور دیر تک ان معتدل عطر آگیں طلائی و نقرئی ہواؤں کی لہروں پر رقص کرتا رہا۔ بعد ازاں میں پھر بیہوش ہو گیا اور اس بے ہوشی کے دوران میں بدن سخت درد کرتا رہا۔ رگیں اور پٹھے کھنچتے رہے۔ مسامات میں سوئیاں چبھتی رہیں اور جسم سکڑتا رہا۔

کچھ دیر بعد پھر میں نے دیکھا کہ وہی وادی ہے۔ بے جی اور گلگندی کے ساتھ میں ایک ابرقی ندی کے کنارے کنارے چلتا ہوا بستی کی طرف جا رہا ہوں۔ بستی سے الگ ایک وسیع باغ تھا جس کے اردگرد سونے چاندی کی دیواریں کھینچی ہوئی تھیں۔ اس باغ کے اندر پھولوں کے گہوارے میں کوئی لیٹا ہوا تھا اور اس

کے چاروں طرف بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔

اس گہوارے کے قریب جا کر میں دھک سے رہ گیا کیونکہ اس میں گلِ نو پڑی ہوئی تھی۔ وہ اتنی زرد اور کمزور ہو رہی تھی کہ تمیز نہ ہو سکتی تھی وہ مردہ ہے یا زندہ وہ عالمِ نزع میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اسکی یہ حالت دیکھ کر میں بے تاب ہو گیا اور بلبلا کر روتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔

میری آواز پر وہ پھر ایک دفعہ خوابِ مرگ سے بیدار ہوئی اور مجھے دیکھ کر ایک معصومانہ انداز سے مسکرائی۔ پھر اپنا نقاہت سے کانپتا ہوا ہاتھ میری طرف بڑھایا جسے میں نے اپنے سینے سے لگا لیا اور اُسی مسکراہٹ کے عالم میں وہ آرام سے سو گئی۔ ایسی نیند جس سے کوئی حشر تک نہ بیدار کر سکے۔

اس کے ختم ہوتے ہی فضا میں ایک دردناک گونج پیدا ہوئی۔ ہوائیں ماتمی راگ الاپنے لگیں۔ میت پر پھولوں کی بارش ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھولوں کے انبار کے نیچے دب گئی۔ ادھر اس ناگہانی صدمے سے میری حالت غیر ہونے لگی۔ انتہائی رنج و غم سے میرے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ زبان سوکھ گئی اور میں بے بسی کی حالت میں ایک زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا۔

بے جی اور گلِ قندی مجھے اٹھا کر ندی کے کنارے لے گئیں۔ اور اس کا ابرق آلود پانی میرے منہ میں ڈالا۔ پھر سیپ کے چمچے سے مجھے سیاہ لیس دار

سی چیز کھلائی جس کے اندر جاتے ہی میرا دل ٹھیک ہو گیا اور طاقت و توانائی بحال ہو گئی۔ میں اپنے کو تازہ دم سمجھنے لگا۔

اب، بے جی نے مجھے پھر وہی کاغذ کا پرزہ دیا جو اس خواب کی ابتدا میں بھی دیا جا چکا تھا۔ یہ بے مطلب اور بے جوڑ فقرے میں پھر پڑھنے لگا۔ ان کے پڑھنے سے پھر مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی اور اس غنودگی کے دوران میں جسم کے اندر پھر پٹاخے چھوٹنے لگے اور مساموں میں ہوا بھرتی رہی اس کے بعد میں پھر ہوا میں پرواز کر رہا تھا اور وہ دونوں پرندے بھی میرے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔

اس فردوس صفت وادی کی جڑاؤ سرزمین اور ہیرے کی طرح ترشی ہوئی سطح بہت دور تک میرے قدموں میں بچھی ہوئی تھی۔ موتی چوٹیوں کی شاندار جھلملاہٹیں اور نورانی منظر جو میری اڑان سے بہت نیچے تھے۔ رفتہ رفتہ ہماری پرواز اتنی بلند ہوئی کہ ہم بالکل فرشتوں کی دنیا کے قریب تر جا پہنچے۔ حتیٰ کہ اس عجوبہ روزگار وادی کی گنگا جمنی سرزمین اور قوس قزحی زیبائشیں حد نگاہ کی نامعلوم پہنائیوں میں کھو گئیں۔ مگر ہم ایک جان توڑ کوشش، تلخ اور آہنی عزم کے ماتحت ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اوپر چڑھتے رہے۔

عین چوٹی پر پہنچکر پھر میری بینائی جاتی رہی اور اسی طرح اندھیرے میں دوسری طرف اترتا رہا آخر انہی مسلسل سرگرمیوں کی بدولت اتنی گہرائی میں پہنچ گیا کہ سانس پھر بحال ہو گئی۔ یہاں میرے ساتھی پرندوں نے پھر میری

کہ ان اپنی چونچوں میں دبائی اور کسی پودے کی جڑوں پر میری آنکھیں ملنے لگے ان کے اس فعل سے میری آنکھیں پھر روشن ہوگئیں اور پہاڑوں کی سخت اور کٹھن حدود سے نکل کر میدانی علاقہ میں نہایت آزادی اور روانی کے ساتھ پرواز کرنے لگا۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ مجھے یاد نہیں۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میں بدستور اپنے بستر پہ موجود تھا۔ لیکن میرا جسم کچھ بھاری اور خستہ سا معلوم ہوتا تھا شاید یہ اُس منحوس خواب کا اثر تھا۔ میں تفکر اور اداسی سے اپنے دماغ پر زور دے کر اس ہولناک خواب کو یاد کرنے لگا جس کا دل شکن نظارا میرے لئے سوہانِ روح تھا۔ نہ میں اسے خواب کہہ سکتا تھا نہ حقیقت۔

میں دم بخود بستر پر پڑا رہا۔ اتنے میں بوڑھا باغ اندر داخل ہوا۔ آج خلافِ معمول وہ خود ناشتہ لایا تھا۔ میں نے تعجب سے کہا۔ "وساؤ کہاں گیا۔"

اس نے کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے تم ناشتہ کر لو۔"

میں نے باغ کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ اترا ہُوا تھا۔ میں نے پوچھا "کیوں بابا خیر تو ہے۔"

"ہاں ہاں تم جلدی جلدی ناشتہ کر دو۔"

بوڑھے کے اصرار پر میں نے ناشتہ زہر مار کیا تو بوڑھے نے بتایا کہ بے جی عظیمہ قریب الموت ہے۔ اس سے آخری بار مل لو۔

بوڑھے کی زبانی یہ بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں بدحواسی سے بھاگتا ہوا نچلی منزل میں گیا۔ آہ بے جی بستر مرگ پر پڑی دم توڑ رہی تھی

"میرے بچے" اس نے مردہ لبوں سے بہ مشکل کہا۔ "کاش میں تمہاری کوئی خوشی دیکھ سکتی"۔

بوڑھے باغ نے مجھے بتایا کہ اس پہ ڈبل نمونیہ کا اثر ہوا ہے۔ اس کی چھاتی اور شانوں پہ بڑے بڑے نیلے داغ پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں صبر کی تلقین کرتی اور دعائیں دیتی ہوئی اس ناپائیدار دنیا سے چل بسی۔

پہلے تو میں صرف خواب کی پریشانی ہی سے ہلکان ہو رہا تھا اب حقیقت کے سامنے سارے خواب فراموش ہو گئے۔ اب میں سمجھا کہ یہ حادثہ اس خواب کی تعبیر ہے جس نے میری زندگی تلخ کر دی کیونکہ بے جی کی موت میری خانہ بربادی اور میری بدبختی کا پیغام تھی جس سے گھر کا سلسلہ ہی درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ گو بوڑھے باغ کی آنکھیں ابھی کھلی تھیں مگر وہ کیا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اپنی رفیقۂ حیات سے بچھڑ کر اسکی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے کئی بار مجھے شادی کی ترغیب دی مگر میں نے انکار کر دیا اور اس دردناک اور نجورہ زندگی سے تنگ آ کر بغیر سوچے سمجھے فوج میں بھرتی ہو گیا۔

بوڑھے باغ نے یہ خبر نہایت خاموشی سے سُنی۔ گو اس کے چہرے کی رنگت زیادہ پھیکی پڑ گئی اور آنکھیں زیادہ دھندلی دکھائی دینے لگیں مگر اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ آخرکار جب میری روانگی کے دن قریب آئے تو اس نے میرا سب سامان اپنے ہاتھ سے تیار کیا اور گھر کی چیزوں کو اکٹھا کر کے دو کمروں میں مقفل کر دیا۔ گویا وہ بھی میرے ساتھ جا رہا تھا۔

۶

ساون کا مہینہ تھا۔ چوماسے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میرے ملازمت پر جانے میں صرف دو دن باقی تھے۔ میں ریٹھے کے گھنگریلے سائے میں چارپائی پر پڑا تھا کہ بوڑھا باغ بھی آ کر میرے ساتھ لیٹ گیا۔ اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے اُسے تسلّی دی مگر وہ ایک دردناک انداز سے کہنے لگا۔

"انوار مجھے طفلانہ تسلیاں مت دو۔ اب میں تمہاری باتوں میں آ کر اپنی اخیر عمر خراب نہیں کرنا چاہتا۔"

پھر وہ سرد آہیں بھرتا ہوا میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ میں چپ چاپ پڑا رہا۔ اس کے دستِ شفقت سے میرا دل اثر پذیر ہوتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نیند نے مجھ پر غلبہ پا لیا۔ آج مجھے پھر ایک منحوس خواب نے آ گھیرا۔ یہ میرا آخری خواب تھا — ہولناک اور لرزہ خیز خواب۔ جس نے میری زندگی

کا آخری سہارا بھی مجھ سے چھین لیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ بوڑھا باغ ریچھے کے ایک مضبوط ڈال پہ بیٹھا ہے۔ ٹہنیوں کی جنبش سے ریچھے کے پھل سے گھنگرو بجنے کی آواز نکل رہی تھی اور بوڑھا باغ مجھے وہی ہاتھی دھار کے پہاڑوں کی کہانی سنا رہا تھا جو بچپن میں مجھے بے بجی سنایا کرتی تھی۔

اس نے کہا۔

"ہاتھی دھار کے ان بلند اور آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں کے پیچھے ایک عظیم الشان وادی ہے جس کا نام ہے کیف۔ وہاں تک جانا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ وہاں نمک نہیں ہوتا اور وہ لوگ نمک کے شوق میں اکثر میدانی علاقوں میں آیا کرتے ہیں۔ ان کے آنے کا طریقہ بھی خاص ہے۔ یعنی وہ لوگ ایک منتر جانتے ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق گرڑ مہاراج نے انہیں سکھایا تھا۔ اس منتر کو پہاڑ کا جادو کہتے ہیں۔ اس منتر کے اثر سے وہ پرندوں کی شکل میں تبدیل ہو کر اس علاقے سے نکل آتے ہیں کیونکہ سوائے پرندے کے وہ راستہ کوئی انسان طے نہیں کر سکتا۔

"کسی زمانے میں وہاں سے ایک پہاڑی آدمی اپنی عورت سمیت اس علاقہ میں آیا۔ ان دنوں گرد و نواح کے پہاڑوں میں سخت قحط تھا۔ اور لوگ جوق در جوق میدانی علاقوں میں جمع ہو رہے تھے۔ اس لئے اگلی زمانے میں محنت مزدوری

کی بھی کوئی قدر نہ تھی۔ وہ پہاڑی جوڑا بہت گھبرایا مگر ان کی قسمت اچھی تھی۔ ان کو جلد ہی کام مل گیا۔

کام کیا تھا ایک بچے کی پرورش۔ ان کی بوڑھی مالکہ بہت نیک دل تھی لیکن پہاڑی جوڑا بھی بہت نمک حلال تھا۔ جس نے اپنی خدمات کے عوض بہت جلد اپنی مالکہ کے دل میں گھر کر لیا۔ اس جوڑے کو تو اس بچے سے ایسی محبت ہوئی کہ وہ یہیں کے ہو رہے اور وطن واپس جانے کا خیال ترک کر دیا۔ مگر اپنے وطن کی خیر و عافیت دریافت کرنے کی خاطر ایک خانقاہ پر اکثر جایا کرتے تھے کیونکہ اس خانقاہ کا مجاور بھی کسی زمانے میں کیف ہی سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اس لئے یہ خانقاہ اب پہاڑی سیاحوں کا اڈا بن رہی تھی۔ جو نیا سیاح کیف سے آتا وہ پہلے یہیں آ کر شب باش ہوتا۔ شامتِ اعمال ایک دفعہ کچھ پہاڑی لڑکیاں کیف سے آ کر اس خانقاہ میں ٹھہریں۔ ان میں سے چند لڑکیاں پہاڑی جوڑے کے عزیزوں میں سے تھیں۔ جنہیں پہاڑی جوڑے نے اپنے مکان میں پناہ دی۔

اس وقت وہ لڑکا جو پہاڑی جوڑے نے پرورش کیا تھا جوان تھا۔ چنانچہ ان پہاڑی لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ اس لڑکے کو محبت ہو گئی۔ وہ لڑکی بھی اُسے چاہتی تھی۔ دوسری لڑکیاں بھی اس لڑکی کی رازدار تھیں۔ ایک دفعہ اس لڑکی کا اپنی سہیلی سے کچھ جھگڑا ہو گیا۔ وہ اسکی سہیلی نے غصہ میں آ کر پہاڑی

جوڑے سے اس لڑکی کے عشق و محبت کا کچا چٹھا بیان کر دیا۔

بوڑھے پہاڑی جوڑے کو یہ بے جوڑ محبت پسند نہ آئی۔ انہوں نے کوئی بہانہ بنا کر اس لڑکی کو واپس بھیجدیا لیکن وطن پہنچکر جب اُس لڑکی پر فریب دہی کا راز کھلا تو وہ بہت پریشان ہوئی اور موسم کی خرابی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی دوسری سہیلی کے ہمراہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر واپس چلی آئی۔

اس دفعہ چونکہ وہ پہاڑی جوڑے کے خوف سے اس لڑکے کے پاس کھلم کھلا نہ آسکتی تھی اس لئے وہ اُسے دیکھنے کے لئے اکثر چیل بن کر اس کے گھر کے اوپر منڈلایا کرتی اور بعض وقت موقع پاکر اس سے مل بھی لیتی اور پھر جادو سے اُس لڑکے کو بے ہوش کر کے خود غائب ہو جاتی۔ چنانچہ وہ لڑکا اس کا معمول بن گیا اور ہمیشہ اس ملاپ کو خواب ہی سمجھتا رہا۔ ایک دفعہ بوڑھی پہاڑن نے اتفاقاً اس لڑکی کو اپنے گھر میں دیکھ لیا۔ اس طرح اس لڑکی کا راز فاش ہو گیا۔ تو اس نے پہاڑی جوڑے سے اس حرکت کی معافی مانگی اور دوبارہ اس گھر میں رہنے کی درخواست کی۔ اس پر بوڑھے پہاڑی جوڑے نے اس لڑکی سے یہ وعدہ لے کر گھر میں رکھا کہ وہ اس لڑکے کی زندگی یوں تباہ نہ کرے گی کیونکہ وہ بڑے گھر کا لڑکا تھا اور کسی بڑے گھر کی لڑکی ہی اس کے قابل ہو سکتی تھی۔

اس طرح وہ لڑکی پھر اس گھر میں رہنے لگ گئی۔ اب وہ اپنے وعدہ

خیال کرتے ہوئے اس لڑکے سے دُور دُور رہتی تھی۔ بدقسمتی سے اُس سال اور بھی کئی لڑکیاں کیف سے آگئیں اور وہ لڑکی اپنا غم غلط کرنے کی خاطر دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر کھیلنے کو چلی جایا کرتی تھی۔ لیکن اس لڑکے کو اپنی محبوبہ کی یہ بات بہت ناگوار گزری اور ایک دن وہ غصہ میں بندوق لے کر اس لڑکی کے پیچھے گیا۔

ادھر اس وقت وہ لڑکی ایک کلنگ کی صورت اختیار کر کے پانی میں تیر رہی تھی۔ جسے اُس لڑکے نے اپنی بندوق سے زخمی کر دیا۔

کلنگ کے زخمی ہونے کی سن کر میرے اشک جاری ہو گئے۔

"آہ بابا تم تو میری ہی کہانی بیان کر رہے ہو" میں نے شکستگی اور پسپائی سے کہا۔

بوڑھے نے میری بات کی کچھ پروانہ کی اور برابر کہانی کہتا گیا جس کا ہر لفظ میرے دل کی عمیق تہوں اور دماغ کے پیچیدہ پردوں میں پیوست ہو رہا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔

"اس کلنگ کا باقاعدہ علاج ہوا۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی۔ بغرضیکہ وہ لڑکی جو کلنگ کے روپ میں تھی صحت یاب ہو گئی تو اس کی سہیلی نے اسے وطن چلنے کی ترغیب دی۔ گو پہاڑی جوڑا اس بات کی مخالفت کرتا رہا مگر اس کی سہیلی نے نہ مانا اور بضد ہو کر اُسے لے گئی۔

چونکہ وہ لڑکی ابھی ابھی ایک لمبی بیماری جھیل کر اُٹھی تھی اس لئے وہ اس

راہ شوب سفر کے قابل نہ تھی۔ لہٰذا اس کے زخم جو ابھی کچے ہی تھے راستے میں زیادہ طاقت صرف کرنے کے باعث پھر کھل گئے اور اس کے پھیپھڑوں میں خرابی پیدا ہو گئی۔

وہاں ایک عرصہ تک صاحبِ فراش رہنے کے بعد جب وہ لڑکی اپنی زندگی سے ناامید ہو گئی تو اس نے اپنی سہیلی کو بوڑھے پہاڑی جوڑے کے پاس بھیجا اور آخری وقت میں اپنے محبوب سے ملنے کی درخواست کی۔ بوڑھی پہاڑن کو لڑکی کی حالت پر بہت رحم آیا۔ وہ لڑکے کو لے کر قاصدہ کے ہمراہ جان کی بازی لگا کر وہاں جا پہنچی۔

لڑکے کے پہنچتے ہی اسکی محبوبہ جاں بحق ہو گئی اور لڑکا غم سے نڈھال ہونے لگا اب بوڑھی پہاڑن کو یہ فکر ہوا کہ کہیں یہ لڑکا اس صدمہ سے بیمار نہ ہو جائے اور پھر واپس نہ جا سکے۔ غرضیکہ وہ بغیر آرام کئے لڑکے کو لے کر واپس آئی۔ لیکن بڑھاپے کے عالم میں وہ اتنی لمبی اور ہلاک کن مسافت برداشت نہ کر سکی چنانچہ اُس پے در پے سفر نے اس کی جان لے کر چھوڑی یعنی گھر پہنچتے پہنچتے اُس کے پھیپھڑے پھٹ گئے اور وہ چل بسی۔

اِدھر اُس کی موت سے اس کے خاوند کا دل ٹوٹ گیا۔ اُسے جینے کی خواہش باقی نہ رہی۔ مگر پھر بھی کوئی چیز اُسے اس دوبھر اور بے کار وقت میں بھی جینے پر مجبور کر رہی تھی جو اس کی اندھی آنکھوں کا نور اور اس کے اجڑے دل کا سرور

تھا۔ لیکن اس کا یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا یعنی وہ لڑکا ان تلخ ناکامیوں سے گھبرا کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ لڑکے کی اس حرکت سے بوڑھے کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ اس علاقہ میں مسافر ہے۔ اور اس نے بھی ٹھان لی کہ وہ اپنے وطن چلا جائے گا۔ گو اس کا بڑھاپا اُسے اس دراز سفر کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم وہ اس لڑکے کی رعانگی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔"

بوڑھے کے آخری فقرے سے ایک پُر درد اور دائمی جدائی کا پیغام سُنکر میں بے قابو ہو گیا۔ یکدم ایک زوردار چیخ کے ساتھ جاگ اٹھا۔ اور ایک بیقرار صدا میرے منہ سے نکلی۔

"مت جاؤ بابا تمہارے سوا میرا کوئی بھی نہیں۔" عین اسی وقت ریٹھے کی شاخیں زور سے ہلیں اور ریٹھوں کے ڈوڈے چھن چھن کر کے بجنے لگے۔ میں نے دیکھا تو درخت کے ڈال پر ایک جسیم پرندہ اڑنے کے لئے پر تول رہا تھا

"مت جاؤ بابا۔ مت جاؤ بابا" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ اس کے جواب میں جسیم پرندے نے ایک دفعہ کرر کر کا اداس نعرہ لگایا اور اپنے لمبے لمبے پر پھیلا کر پرواز کرتے ہوئے آسمان کے بحرِ نیلگوں میں کھو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

۷

بابا باغ لاپتہ تھا۔ اس کے کپڑے ریٹھے کی ڈال سے ملے۔ نہ جانے وہ

وہ کہاں گیا۔ یہ خواب تھا یا حقیقت۔ قارئین خود اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مگر میں تو اب یہی کہوں گا کہ۔ ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

رسیلا

۱

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک نہر کے قریب واقع تھا۔ جس سے تھوڑے فاصلے پر بسنت لام کی کٹیا تھی۔ یہ ایک چرسی سادھو تھا جس کے پاس قصبے کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے۔ بسنت لام زندہ دل ملنسار اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اسکی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے واڈدی نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اسکی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان۔ رات کے پچھلے پہر آسا گانا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پَو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین لے اور پرسوز آواز سے ملتانی زبان میں۔

دت نہیں آوناں دلیں پیارے کھیڈن دے دن چار نی ماٹے

گانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شان ربوبیت کے ساتھ کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالم ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اسکے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آسا کا کیونکہ یہ راگنی میری روح کی غذا بن چکی تھی اس لئے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت سماجت کر کے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

۲

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا مگر اپنی دیرینہ شان و شوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار، سکول، ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک

ہی آتی تھی اور باقی چالیس میل کا سفر لاری یا کسی دوسری سواری کے ذریعے طے کرنا پڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا۔ اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی جو چودھری کہلاتے تھے ان کی حویلیاں بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ گو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا مگر شاہجہان کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز و شاداب تھا اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پار کوس بھر کے فاصلے پہ ٹکر نامی ایک گاؤں آباد تھا جس کے اردگرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں اور موضع ٹکر میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبند رام تھا۔

گوبند رام نہایت بوڑھا آدمی تھا۔ تمام چودھری برادری کا سردار تھا۔ راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ زنگ آلود ڈھانچے گذشتہ عظمت اور مٹی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیا کرتے تھے۔

پار جانے کے لیئے نہر پر شاہانِ مغلیہ کے وقت کا پل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کا ہم پلہ تھی۔ اس نہر کے کنارے الگ تھلگ میرا

سکول تھا۔

عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دو چار سنگی ساتھیوں کو لے کر میرے پاس آیا کرتا تھا جو طرح طرح کی بے سر و پا خبریں سناتے اور بے تکی ہانکا کرتے اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ سکول کے وسیع احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا، بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت بولنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور چرسی دوست آگیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"یار بڑے بیت باز بنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔"

مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔ "یار کیا بات ہے۔"

اس چرسی نے کہا "سنا ہے کہ مظفر گڈھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔"

یہ خبر سنکر سب کے سب سہم گئے۔

"اب کیا ہوگا ماسٹر جی سب نے پریشانی سے کہا۔

میں نے جواب دیا "خدا رحم کرے۔ اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں"۔

وہی چرسی کہنے لگا "خدا اب کیا رحم کرے گا دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے۔ کہ ایک گائے بیچاری سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آ رہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے کو کسی نے پوچھا تک نہیں ——— اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سُنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اُس پر ریجھ گیا اور اُسے گھر ڈال لیا ——— ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھولا ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا، شامت کا مارا، چودھری متھرا داس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اس وقت چودھری متھرا داس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولائت پاس کر کے آیا ہے، اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا اور چور چور کہکر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی اُسے بڑے سراپ دیئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی اٹل ہوتا ہے جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے۔ جو ظالم کو نشٹ کر دیتی ہے"۔

وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے نئی نئی افواہیں اُڑتی رہیں۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں پھیلنی شروع ہو گئی۔ بیساکھ کے آخری دن تھے۔ صحرا کی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے کوئل اپنی پر درد آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں مست رام بھی آ گیا۔

"کچھ آپنے بھی سُنا ماسٹر جی" اس نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔ کیا کچھ نئی خبر لائے ہو۔" میں نے پوچھا۔

مست رام نے کہا "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع لوہڑی میں ایک ڈنگو ترے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ میں نرگ کی چڑیل ہوں جو دنیا کو ہڑپ کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری اور بعد ازاں اس نے من کوٹ کا رخ کیا۔ آہ اب کوئی دن میں اس شہر پہ بھی تباہی آنے والی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا اُسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا اس کی یہ باتیں نہ سن لے۔ مجھے اس کی بد حواسی پہ بے اختیار

ہنسی آگئی۔

"کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے" اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میں نے کہا "بھئی مست رام بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب نیلاریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی لایعنی داستانیں گھڑا کرتے تھے۔"

وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ ماسٹر جی سب باتیں تو جھوٹ نہیں ہوتیں پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ خود دیکھ لیں گے بُرے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں۔

میں نے اکتا کر کہا "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ابھی دکھا دو۔"

مست رام نے متانت سے کہا "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتوں کا رونا نہیں سنا۔ وہ آجکل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گنی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں جنہیں کتا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چیختا چلاتا ہے۔

مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا کہ رات کو

اتفاقاً میری آنکھ کھلی تو اس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا۔ جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہُوا اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پرواہی سے کہا۔

"اونہہ یہ کوئی بڑی بات نہیں کُتے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ بُرے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں"۔

مست رام نے زچ ہو کر کہا "اچھا نہ سہی۔ لیکن یہ تو بتائیے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانے کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کسی بیگناہ کو سولی چڑھایا جاتا تھا تو سُرخ آندھی آتی تھی۔ مگر اب تو آندھی بھی نہیں۔ مگر آسمان بلا وجہ خونِ کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں"۔

یکدم میری نظر سامنے کی طرف اُٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا مجھے سچ مچ ایسا معلوم ہُوا کہ جیسے وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سُرخی سے لہو لہان ہو رہا ہے۔ بلکہ نہر کا پانی بھی سُرخ بانات کی چادر کی طرح ہلکورے لیتا اور موجوں کی خونیں سلوٹیں ڈالتا سُست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ تاہم میں نے ایک اونہہ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

۳

جیٹھ کا آغاز تھا۔ حسبِ دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا دو دن سے میں نے مست رام کو کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سہ پہر کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ اس کی کٹیا گلو کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف پانی کا چوبچہ تھا۔ جہاں اس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اس وقت چرسیوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ سب تعظیم کو اٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے"۔

مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ماسٹر جی میرا بچہ ڈڈرو بیمار ہو گیا تھا"۔

میں نے کہا "بچہ ڈڈرو کون۔ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے جسے چھاتی سے لگائے ہو"۔

اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ہاں ماسٹر جی یہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پر میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ہوتا ہے"۔

اس کے بعد اس نے اُٹھ کر کٹیا سے ایک نیا حقّہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اُس نے پاؤں دبانے شروع کئے۔ میں نے کہا "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی۔"

مست رام نے کہا "ماسٹر جی آجکل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی۔"

میں نے ہنسکر کہا۔ "وہ کیسے کیا اس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔"

اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چرسی دوست سے کہا۔ "اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سناؤ۔"

دھنی لمبی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چرسیوں کی طرح مرا ہُوا نہ تھا یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک جھرجھری سی لی پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا۔

"ماسٹر جی رام رام کچھ نہ پوچھئے۔"

پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا

"میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں جنہیں صبح سویرے ہی اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ کل رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعے

والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا تو وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہڑی کا ایک چھٹی رساں بھی تھا جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آرہا تھا اور صبح اُسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت و سماجت پر اس نے کہا بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بے چاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ ہم سب بہو بیٹی والے ہیں۔ اسے لے جانے میں کوئی ہرج نہیں۔ چھٹی رساں کے کہنے پر میں نے اُسے سوار کر لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بُری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آکر اس کی لگام پکڑ لی اور قدم قدم اُسے چلانے لگا حتیٰ کہ لگام کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ جن پر واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر کیا ہوا۔"

دھنی کہنے لگا۔

اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔

عین اسی وقت چھٹی رساں نے یکّہ سے اترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پاکر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دُور پر ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اس نے مجھے کہا۔ بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔ میں نے کہا وہ کیسے چھٹی رساں کہنے لگا کہ میں اس کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ کسی وقت جوان دکھائی دیتی۔ کسی وقت بوڑھی۔ کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ تو معلوم ہُوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں۔ میں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اُتر آیا۔

چھٹی رساں کی بات سُن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ بڑا دل گردے والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقعے پر دل چھوڑنا مناسب نہیں اور اس کے بعد وہ پھر یکہ پر سوار نہ ہُوا بلکہ گھوڑا پکڑ کر چلانے میں میری مدد کرتا رہا اور اس کی ہمت و کوشش تھی کہ میرا یکہ پَو پھٹتے ہی موضع لوہڑی پہنچ گیا جہاں میں نے اپنی سب سواریوں سے کہا۔ چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔ اور میں آگے نہیں جا سکتا۔ اس لئے کرایا معاف کرتا ہوں۔ سواریاں اُتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی۔ لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ لو یا نہ لو۔ مجھ سے ضرور لے لو۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دے دیا۔

اس قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے جانے پر چھٹی رساں نے کہا۔ بھئی۔ تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے۔ میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا "ہائیں یہ کیا" اس نے نوٹ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو معمولی کاغذ ہے۔" میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جھک گیا۔ چٹھی رساں نے کہا ٹھہرو بھئی اس پر تو کچھ لکھا ہوا بھی ہے اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب لے جا کر پڑھنے لگا۔ کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ "یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی مگر تمہارا یکہ دیکھ کر جی میں آئی کہ اسی پہ چلی جاؤں جلدی جا پہنچوں گی مگر یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھوڑا میرا بوجھ نہ اُٹھا سکے گا کیونکہ میں دراصل عورت کے بھیس میں چڑیل تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے جو یکہ کو گھسیٹ گھسیٹ کر لوہڑی تک لے آئے۔ میں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ من کوٹ تو مجھے پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جان بخشی کرتی ہوں۔" اس مضمون سے ہمارے ہوش اُڑ گئے میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا۔ اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا تا کہ من کوٹ جا کر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں۔ اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً مجھے من کوٹ پہنچا دیا مگر من کوٹ پہنچکر

جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔"

ابھی دمنی اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس و خاشاک اڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرایا۔

"اوہ۔ کتنی سخت آندھی ہے۔" مست رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی بلائے ناگہانی کی طرح تیز روی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا بنگلوں کی طرف بھاگا۔ مگر میرے پہنچتے پہنچتے ہی ہر طرف دھند لکا چھا گیا۔

یہ آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپّر صاف اڑ گئے۔ آم کا بور بالکل جھڑ گیا۔ تمام رات آندھی بڑے زور شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو بھی پلنگ کا پیش خیمہ تصوّر کرتا تھا کیونکہ ان دنوں اس کو سوائے پلنگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا۔ میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اس وقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا مگر شام کو پھر

وہی خبط لئے آ دھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چرسی بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ماسٹر جی مہاراج۔ آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی ہے۔ کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے۔"

میں نے کہا "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو۔"

مست رام نے جواب دیا "مادھو خود ہی بیان کرے گا۔ اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں۔ کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اُڑا دیتے ہیں۔"

مادھو ادھیڑ عمر کا بھٹیارہ تھا جس کے سر پہ لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور گلے سے ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا۔ جس کی شکل و شباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "سناؤ بھئی مادھو کیا بات ہے۔"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مگر دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا۔"

مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا "مہاراج میں اس پوتر سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔"

مست رام نے کہا "اچھا تو پھر بیان کرو"۔

مادھو نے کہا۔

"مہاراج۔ دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا۔ اور جب قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا۔ میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہوگا کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کو نام سے کیسے پکار سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں پھر آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

بازو پر ہرمل کا کھیت تھا۔ میں اس طرف ہو لیا۔ تو کچھ دور پر ہرمل کے کھیت میں ایک بڑھیا دکھائی دی۔ جو اپنے بدن پہ سالونا لئے پڑی تھی۔ اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں دہل گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں بہت پیاسی ہوں۔ جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا۔ اور اُٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں۔ اس نے حکم دیا کہ جا

کر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہکر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اونچی آواز میں پکار کر کہا مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ میں پلیگ ہوں اگر تم پانی لے کر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں۔ اُس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل پہ اُتر گئے اور خوفزدہ ہوکر ایسا بھاگا کہ گھر پہ آکر دم لیا۔"

اُس کی یہ مضحکہ خیز داستان سُن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے"؟

مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا"۔

میں نے اُس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا مُوتی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہوگیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا۔

بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہئے۔ اور تم مہربانی کرکے ذرا گھر تک پہنچادو۔ کیونکہ اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میں نے اس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اُسے گھر تک پہنچانے جائے آخرکار اُسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا۔ "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا"۔

مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا۔ "ماسٹر جی اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے"۔

یہ سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اعتباری سے کہا۔ "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا"۔

مست رام نے کہا۔ "ماسٹر جی مر تو وہ اسی وقت گیا تھا۔ جس وقت اس کے سر پر پلیگ نے چپت لگائی تھی"۔

میں نے کہا۔ "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا۔ واہمہ کا شکار ہو گیا ہوگا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا"۔

مست رام نے کہا۔ "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آ کر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ آہ اس کا منہ اوپر سوجا ہوا تھا اس کے گلے میں

پلیگ پھوٹی تھی"۔

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہؤا جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پر رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے ہاں بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا غرضیکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھلدار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہؤا کہ انسپکٹر صاحب کا حکمنامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آن نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی اس نے کہا "میں بھی نندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سن کر آیا ہوں"۔

میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے"۔

اس نے کہا "نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری دلگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا جہاں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پہ اُسے ایک عورت ملی۔ جو دھاڑیں مار کر رو رہی تھی اس کی آواز بہت

دردناک تھی. اس نے چودھری سے خیرات مانگی. آدھی رات اور سنسان سمے میں اس کی کمزور آواز کا چودھری پر بہت اثر ہؤا. اُس نے کچھ زرِ نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا. مگر عورت نے وہ پیشکش قبول نہ کی. اور کہا میں بھوکی ہوں مجھے کھانے کو کچھ دو. چودھری نے نرمی سے کہا. یہاں میرے پاس کچھ نہیں البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا. چودھری کا جواب سُنکر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی. اور پھر بولی نہیں میں تمہارے گھر نہ جاؤں گی. کیونکہ تم بھلے آدمی ہو. بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا. اب سُنا ہے کہ وہ یگیہ کی تیاری کر رہا ہے"۔

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا. اسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دو نے انہوں نے مجھے بھی دیئے. میں نے پوچھا. "یہ کہاں سے آئے ہیں"۔

انہوں نے کہا. "چودھری درگا داس کے ہاں سے"۔

میں نے کہا "کیا تقریب ہے"۔

انہوں نے جواب دیا" کہ چودھری جی نے یگیہ رچایا ہے"۔

میں نے کہا. "کیوں"

انہوں نے ہنسکر جواب دیا. "ان کی مرضی"۔

میں لاجواب ہو گیا اور دو نے چھکے سے اُٹھا کر رسوئیا کے حوالے کر دیئے۔

۴

رفتہ رفتہ من کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آ گیا اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ من کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر کر مر جاتے اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے اور باقی کثرتِ اموات کی بدولت مردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے بھی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس دہشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔"

مست رام نے کہا۔" یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے۔ کیونکہ یہ ٹلکہ جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر کون سا اتنا دُور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے"۔

مست رام نے کہا۔ "نہیں وہاں پلیگ نہیں جاسکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے"۔

میں نے کہا۔ "مگر پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی"۔

مست رام نے جھوم کر کہا۔ "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی۔ رسیلے کی۔ جس کا نام سُنتے ہی پلیگ رفوچکر ہو جاتی ہے"۔

میں نے تعجب سے کہا۔ "رسیلے کی نگری وہ رسیلا کون ہے۔

مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی تھا گُنی آدمی تھا۔ بلوان تھا ایشور کا روپ تھا ایک وقت میں اس نے پلیگ کو اپنی قوتِ بازو سے زیر کیا تھا"۔

میں نے اشتیاق سے کہا۔ "وہ کیسے"۔

مست رام کہنے لگا "بہت لمبا قصّہ ہے۔ جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں"۔

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہوگیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دہشت محیط رہتی تھی۔ اور نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں

انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے۔ تاکہ بستر گول کر دوں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا بہت کم کر دیا تھا کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسوئیا بھاگ گیا تھا اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو ثقل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولھا جھونکا اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا۔

پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی جس سے میں چونک اٹھا اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اُف خدا بچائے۔ کھڑکی کے باہر مجھے ایک نہایت مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔ یہ چہرہ ایک ضعیف عورت کا تھا۔ جس کا رنگ مٹیالا تھا۔ اور منہ پر جابجا سیاہ دھبے پڑے تھے۔ آنکھیں اُبھری ہوئی اور سُرخ تھیں۔ یہ عورت غصیلی آواز میں خود بخود بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے کہا۔ "تم کون ہو"۔

بڑھیا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم ہیں"۔

اُس کے بے باکانہ جواب پر گو میں حیران رہ گیا۔ تاہم اُسے جھڑک کر کھڑکی سے ہٹ جانے کو کہا۔ جب وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اور میں نے فوراً اُٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ لیکن جب واپس چارپائی کی طرف آیا۔ تو اُسے سامنے دروازے پر کھڑا پایا۔

اُس نے ایک بدرنگ سا لہنگا اور چولی پہن رکھی تھی اور سر سے ننگی تھی۔ سر کے بال جو خشک ہو کر جٹاؤں کی شکل میں ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے تھے۔ مٹی سے اٹے رہے تھے۔ اس کے ہاتھ خاص طور پر بدنما اور غلیظ تھے۔ انگلیاں کچھ عجیب طرح کی ٹیڑھی اور ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے اس بڑھیا کو دیکھ کر کیوں میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں مائی کیا چاہتی ہو"۔

بڑھیا نے جواب دیا۔ "تمہارا سر صدقہ"

میں نے کہا۔ "میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ میرا سوٹیا کل سے بھاگا ہوا ہے۔ خود کھانے سے ناچار ہوں"۔

بڑھیا نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔ "میں بھی تو ناچار ہوں۔ تمام شہر خالی پڑا ہے۔ اگر کچھ دے دو گے تو تمہارا ہی بھلا ہے۔ لیکن تم لوگ جان تو

دے دیتے ہو تاہم اس کی قیمت نہیں دے سکتے۔"

بڑھیا کی گفتگو سے میں حیران رہ گیا کیونکہ اس کا اندازِ گفتگو سر بسر تحکمانہ تھا وہ بجائے التجا کے دھمکی دے رہی تھی۔

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسی ناپاک اور شیطانی جھلک دکھائی دی۔ جس سے گھبرا کر میں نے کہا۔ "مائی جی یہ کمرہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ جو چاہو لے سکتی ہو۔" بڑھیا آگے بڑھی۔ اور برتنوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مٹی کے ایک برتن میں تھوڑے سے کالے ماش پڑے تھے جو اس نے لنگے کے پلو میں باندھ لئے پھر تپائی سے چابیاں اُٹھا کر میرا کیش بکس کھولنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھے زرِ نقد جانے کا اندیشہ تو ہوا لیکن روکنے کی ہمّت نہ پڑی۔

کیش بکس میں ڈیڑھ سو کے قریب روپے تھے مگر اس نے صرف ایک پیسہ اُٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں ہکّا بکّا ابھی اسی طرح کھڑا تھا اور کیش بکس بھی بدستور میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔ کہ عین اسی وقت باہر سے مست رام کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور بے صبری سے کہنے لگا۔ "کیا وہ یہاں آئی تھی"؟

میں نے پوچھا۔ "کون"؟

ست رام نے جواب دیا۔ "پلیگ۔ آہ میں نے اس سے سخت کلامی کی"
ست رام کی زبانی پلیگ کا نام سُن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "پلیگ تو نہیں۔ ایک بڑھیا بھکارن آئی تھی۔"

اس نے کہا۔ "وہ کہاں ہے۔"

میں نے کہا۔ "چلی گئی۔"

"آہ کدھر گئی" اس نے بدحواسی سے کہا۔

میں نے لاعلمی ظاہر کی۔ تو اس نے پوچھا۔

"تم نے اسے کیا دیا۔"

اس پر میں نے اُسے وہ سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح آئی اور کس طرح خیرات لے کر رخصت ہوئی۔

وہ کفِ افسوس ملتے ہوئے بولا۔ "بس اب تو اس کے پلیگ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا اُس نے صدقہ میں آپ سے صرف کالے ماش اور تانبے کا پیسہ لیا۔ یہی دو چیزیں ہی تو صدقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ اُف اب میری خیر نہیں۔"

میں اس کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر تسلیاں دینے لگا۔ حالانکہ خود میرے دل میں بھی ہول اُٹھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح غم عالم میں کھویا

بھوا واپس چلا گیا اور میں اس روز بہت مغموم رہا۔ شام کے قریب میں اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ مگر وہ وہاں نہ ملا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا اس لئے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں واہمہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی خیال میں میں نے رات کو بھی بڑے بڑے خواب دیکھے۔ مگر شب کی آخری ساعتوں میں جب مست رام نے گانا شروع کیا۔

وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن وسے دن چار۔

تو جان میں جان آگئی۔

صبح اشنان سے فارغ ہو کر میں پھر مست رام کی کٹیا کی طرف گیا۔ وہ گھٹنوں پر سر رکھے آنگن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی چلّا کر کہنے لگا "ماسٹر جی ادھر مت آنا ابھی میری کٹیا میں ایک مردہ چوہا پایا گیا ہے"۔

میں نے مضطرب ہو کر کہا "تو پھر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ ادھر میرے مکان پر چلو۔ تمہارا یہاں رہنا اچھا نہیں"۔

اس نے کہا اچھا ابھی نہا کر آتا ہوں۔ آپ جائیے"

میں سکول میں آکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں غائب رہا۔ آخر شام کو وہ میرے پاس آیا۔ آج اس نے نئے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے گویا نشہ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک شکیل جوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ آتے ہی پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور تھکاوٹ کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے کہا۔

"بھئی کہاں رہے میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس نے کہا "کمیٹی والے کٹیا کی صفائی کرنے آگئے تھے پھر مجھے پکڑ کر کمیٹی لے گئے۔ جہاں انہوں نے تمام دن بٹھائے رکھا اور اب ٹیکہ لگوا کر خلاصی ہوئی میں ادھر سے آتے ہی آخری سلام کے لئے آپ کے چرنوں میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "تو تم بھی کہیں جا رہے ہو۔"

اس نے کہا۔ "ہاں سمن ... چکا ہے اب تو جانا ہی پڑے گا۔"

میں نے پوچھا "کیسا سمن"۔

مست رام نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہی مردہ چوہا"۔

میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "جانے بھی دو۔ وہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ نئے کپڑے پہن کر کتنے بھلے معلوم ہوتے ہو۔"

مست رام نے بدستور غمگین لہجہ میں کہا۔ "ہاں اسی کو تو موت کا جوبن کہتے ہیں۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کریہ المنظر آدمی ہوں۔ ماسٹر جی مجھے دنیا چھوڑنے کا کچھ غم نہیں صرف ان بے زبان جانوروں کا خیال ہے۔ جو بیچارے کل تک لاوارث ہو جائیں گے۔"

میں نے اکتا کر کہا۔ "اچھا یہ ذکر چھوڑو اس وقت کوئی پھڑکتا ہوا گیت سناؤ"
میرے اصرار پر مست رام نے سوز و گداز سے بھرا ہوا ایک ایسا گیت شروع کیا جو پچھلے زمانے میں دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا۔ اسکی درد بھری آواز بلند ہوتے ہی فضا میں ایک اداسی کی لہر دوڑ گئی۔ ان غمگین اور الوداعی نغمات کے اثر سے ایسا معلوم ہونے لگا گویا ہزاروں بے بس دلہنیں اپنی مسرت بھری آزاد دنیا کھو کر سسرال کے مایوس کن اور تاریک ماحول میں دھکیلی جا رہی ہیں یا ہزاروں مسافران عدم جنکی رنگین اور دلچسپ زندگیاں فرشتۂ اجل نے جبراً ختم کر لی ہوں، شمشان بھومی کی طرف رواں ہیں۔ مجھ پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد مست رام نے گانا ختم کیا اور اپنی کٹیا میں واپس چلا گیا۔ کیونکہ رات بھر اسے اپنے کبوتروں سے جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ چاندنی رات تھی میں بھی اپنا دل بہلانے کی خاطر نہر پر چلا گیا اور رات کو دیر سے واپس آیا۔ چبوترے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بستر لگا کر لیٹ گیا۔

آج رات بہت گرم تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت امس ہو رہا تھا۔ ساکت و صامت آسمان کے عین درمیان چاند گوہر شب تاب کی طرح چمک رہا تھا جس کی خاموش کرنیں درختوں کی گھنی تاریکیوں کو چیر کر تھکی ماندی شکستہ حال دھرتی کے میلے خاکستری دامن پر روپہلی نقش و نگار بنا رہی تھی۔

دفعتاً ماحول کچھ ایسا گم سم اور چپ چاپ ہو گیا کہ میرا دل خود بخود کسی نامعلوم دہشت اور پوشیدہ خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس روح فرسا سناٹے میں کونسی ایسی بے چینی اور تلملاہٹ نہاں ہے جسے آنکھیں تو نہیں دیکھ سکتیں مگر دل شدّت سے محسوس کر رہا ہے۔

نہ جانے اس قیامت خیز رات کے خطرناک لمحوں میں کونسی مخفی قوت کسی کوشش میں مصروف تھی۔ کونسی پر اسرار ہستیاں ادھر اُدھر چل پھر رہی تھیں۔ کون سی غائبانہ لاہوتی مخلوق کی آمد پر ایسا ہنگامۂ خاموش برپا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ماحول کیوں اتنا مسموم ہو رہا تھا جس کے جانکاہ اثر سے میری حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔

آخر میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی۔ جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اُٹھا اور کہنے لگا۔

”مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔“

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا جیسا کہ اس کی عادت تھی۔ میں نے کراہتے ہوئے پھر اُسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔

”مالک میرا بھی یہی حال ہے۔“

میں نے نڈھال ہو کر کہا ”تو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔“

اس نے جواب دیا "مالک وجہ تو جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو"۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ "ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ یہاں علمیت کا سوال نہیں۔ تجربہ علیحدہ چیز ہے"۔

چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا۔

"مالک کئی برس گذر گئے۔ میں اس وقت جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔ ہمارے گاؤں کے چودھری کی دوسرے گاؤں کے چودھری سے سخت دشمنی تھی۔ لہٰذا اسے چوری کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اس نے مجھے چوکیداری پر ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا اور اسے بے خوابی کی شکایت رہتی تھی اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودھری کی حویلی پر چلا آتا تاکہ رات آسانی سے کٹ جائے ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا گیا اور اسی طرح ایک پر ہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہو گئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ مگر میرے باپ نے کہا بیٹا حوصلہ کرو اور بھجن گاؤ کیونکہ اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے جس کی پیشوائی کے لئے معمولی یم دوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے۔

غرضیکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خود بخود زائل ہو گئی۔

آخر معلوم ہؤا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں پجاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے"
میں نے متوحش ہو کر کہا۔" تو کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گردوپیش
کوئی موت واقع ہونے والی ہے"۔

جی ہاں ضرور"۔ چندو نے بڑے وثوق سے کہا۔" اس وقت کوئی پوّتر روح
دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر
سمیت وارد ہؤا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی تیکھی جنبش سے مہیب خاموشی اور
لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے"۔

چندو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ میں فرط خوف
سے بے حال ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا" آہ وہ فرشتہ شاید
میری ہی روح قبض کرنے کو آیا ہے"۔

چندو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔" مالک ایسی بات نہ کہو۔ ابھی کوئی دم میں
یہ سختی رفع ہو جائے گی۔ آؤ وہی بھجن گائیں۔ جو ایک ایسے ہی وقت میں میں
نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے"۔

غرضیکہ اس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں
بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گاتا رہا مگر باوجود اس کے
کئی گھنٹے تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی
تھی مست رام بھی آج ایسا خاموش تھا۔ کہ جیسے راگنی آسا چھیڑنا بالکل بھول چکا ہو۔

آخر خدا خدا کر کے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے بے حس وحرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے۔ برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی۔ اور ماحول بتدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے دماغی انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آگئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ جس کی ہر کرن تپی ہوئی سلاخ بن کر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اُٹھ بیٹھا۔ چندو اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا۔ مجھے بیدار پا کر میرے پاس آگیا۔ اور مزاج پرسی کے ساتھ ساتھ حسبِ معمول اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ملنے لگا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔

"اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بے شک کہدو۔"

"مالک" اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ "رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی۔"

میں نے اسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا۔ "یعنی"۔

اس نے جواب دیا۔ "یعنی رات کو ایک بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کون"۔

چندو بولا۔ "مست رام"۔

میں نے بدحواسی سے چلا کر کہا۔ "کیا مست رام مر گیا۔"

"ہاں مالک ابھی اسکی لاش کمیٹی والے اُٹھا کر لے گئے ہیں" اس نے افسوس سے کہا۔ مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پر لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے انسپکٹر صاحب کا حکمنامہ ملا کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہٰذا اسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا آیا۔

۵

اس واقعہ کے چند ماہ بعد موضع ٹکر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ ٹکر کے قریب رسیلے کی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودھری گوبند رام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودھری سے رسیلے کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا ہلکی ہلکی معتدل ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع و لامحدود صحرا، رات کی خاموش اور تاریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ منقشی چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پر جس کے کونوں میں کلسوں پر بڑے بڑے روغنی آبلان نصب تھے، آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

بوڑھا چودھری گہری سانس لے کر کہنے لگا۔

"کسی زمانے میں ہمارے گھر میں ایک بوڑھا مصر دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے

باپ کے وقت کا بہت نیک اور وفادار ملازم تھا۔ رسیلا اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصر اسے دیکھ دیکھکر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پر قدم رکھا تو بوڑھا مصر چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

"بوڑھی مصرانی بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بلکہ اسکے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصّہ لیتا اپنی حسن لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے۔

"میری اکلوتی بیٹی رادھا اس وقت بارہ سال کی تھی یہ بہت تند اور تیز مزاج کی لڑکی تھی۔ رسیلے کے ساتھ اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتی تھی اکثر بلا وجہ ہی پیٹ ڈالتی تھی۔ بوڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اسکی بیٹے کی آنکھوں کو دیکھکر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز بڑھتی گئی۔ اسی طرح دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ رسیلا چودہ سال کا ہو گیا۔ رادھا اس وقت بیس سال کی تھی۔ اسکی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چھ ہی سال ہی ودھوا ہو کر ہمارے گھر واپس آگئی۔ اب رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی

سے اسکی خدمت کرنے لگا مگر وہ بدستور اسکی مخالف رہی۔

"رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہوتا گیا۔ جوان بھی ایسا جسکو ورزشی جوان کہنا زیادہ موزوں تھا جس طرف نکل جاتا انگلیاں اُٹھنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکیاں اسکی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اسکی دوستی پہ فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اسکو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا اسکی شکل وصورت میں کچھ ایسا شاہانہ پن تھا کہ سادہ لباس میں بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے بجائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اسکے سپرد کر رکھا تھا جس کے حسن انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

"بوڑھی معرانی بیٹے کی سعادتمندی اور قابلیت پر پھولے نہ سماتی تھی۔ اسکی زبردست خواہش تھی کہ بیٹے کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہٰذا اُس نے من کوٹ کے ایک اچھے کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اسکی سگائی کر دی لیکن جب لڑکی والوں نے شگن بھیجا تو بیٹے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ معرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت بھی کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

بوڑھی معرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہوئی اور روتی ہوئی میرے پاس آئی تا کہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پہ مجبور کروں چنانچہ میں نے رسیلے کو بلا کر پہلے تو ماں کا دل دکھانے پہ ملامت کی اور پھر پدرانہ شفقت سے اسے شادی پر آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن میں بھی کوشش میں ناکام رہا۔

"اس نے کہا مالک یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ لیکن شادی کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤنگا کیونکہ میں عورت ذات سے سخت نفرت کرتا ہوں۔

میں نے حیرت سے پوچھا "اس کی وجہ"۔

اس نے جواب دیا "میری مرضی"۔

میں لاجواب ہو گیا۔ رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اسکے متعلق گاؤں میں منافرت کی لہر دوڑ گئی۔ گاؤں کی لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصور کرنے لگیں لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول پر ٹوکنے لگے تاکہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

"رادھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آگیا اس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کے کوسا بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضیکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بوڑھی مہرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرگباش ہو گئی۔

"ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خود مختار اور آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کیساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس سے صاف ہوتا گیا۔ لوگ اُسے سنت رسیلا کہنے لگے اور اسی حالت میں اس نے زندگی کی پچیس منزلیں طے کر لیں۔

"اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ گھر کے تمام افراد یکدم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی رہے۔ بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

"ان دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوتیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت ہی سے مر جاتے۔ آخر کار خلقت نے بدحواسی سے گھر چھوڑ کر باہر صحرا میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

"رادھا چونکہ واحد اولاد ہونے کی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سینہ کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لئے اسکی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اس موقعہ پر رسیلے نے اسکی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ شاید نہ کر سکتا۔ وہ دن رات برابر اسکی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا اسکی صورت سے وحشت برستی تھی اسکی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہو جائے

"خیر ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گذر گئے اور ہمیں اسکی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی۔ کیونکہ عام طور پر یہ مرض "آنا فانا" اپنا کام کرتا ہے۔ اور جو مریض کچھ اٹک جائے۔ وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے لیکن جونہی ساتویں رات آئی

تو رادھا نے پھر درد و کرب سے تڑپنا شروع کیا۔ یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہو گئی جس سے اسکی حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

"رادھا کو دم توڑتے دیکھکر گھر بھر کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ میں فرطِ غم سے نڈھال ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا۔ جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو۔ مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اُسے شکتی اور شانتی نصیب ہوتی ہے لہذا میری بھی یہی حالت تھی۔ میں نے بے اختیار مندر کا رخ کیا۔

"پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے گویا ہر ذرّہ بذاتِ خود ایک چاند تھا۔ لیکن نصف شب کی ہلکی ہلکی ہواؤں کی فراقیہ گونج سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اُداسی اور رقّت چھا رہی تھی۔ صحنِ باغ میں چاندنی سے منوّر زمین پر درختوں کے سائے اس طرح متحرک تھے جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی روحیں عالمِ ارواح سے اتر کر اپنے مردہ تنوں کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ غرضیکہ اس سنسان اور ہُو کے عالم میں، میں بھی ایک روح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

"مندر کی پُرہول اور گہری خاموشی میں حقیقی مسرت برس رہی تھی۔ میرے دل

میں روحانیت کا چشمہ ابلنے لگا۔ میں فوراً جوشِ عقیدت سے مورتی کے سامنے جھک گیا اور نہایت عاجزی سے رادھا کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگا۔ درحقیقت من کی صفائی اور آتما کی تسلّی کے لئے پرارتھنا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

"اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہُوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب ایک کونے میں سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہُوا۔

"آنیوالا رسیلا تھا۔ جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا۔ اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچا لے یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اس پر مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بوڑھی ماں میری شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں اس کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی رادھا کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا وہ خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے۔ جسکی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی رادھا جس کا میں پجاری ہوں۔ میرے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بھگوان اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا!! کثرتِ گریہ سے اسکی آواز رک گئی۔

اس انوکھے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً کونے میں دبکا رہا۔ کچھ

وقفہ کے بعد اس نے پھر سر اُٹھایا۔ اور کہنے لگا۔ آہ بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقع دو۔ تاکہ میں پلنگ سے زور آزمائی کر کے اسے شکست دوں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رادھا کو بچا لوں۔

عین اسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی۔ کہ اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پہ قدرت حاصل ہوتی۔ تو تمہیں شیخیاں بگھارنے کا مزا چکھا دیتی ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ۔

یہ آواز سُنکر میرا دل دہل گیا۔ مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردی کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر اُٹھا۔ اور تیر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اُسے پکڑنے کیلئے اُٹھا تو سہی مگر دروازے پر پہنچکر میرے پاؤں خود بخود رک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دُور سے مرغِ سحر کی دھیمی سی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں گھُل مل گئی۔

پیغامِ صبح سُنکر میں یکدم چونکا اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور وحشت برس رہی تھی۔ خشک چاندنی شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ گئی تھی۔ لیلائے شب کے منتشر سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں اِدھر اُدھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک الو کی چیخوں کی مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ادھر گیا لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچکر مجھے رکنا پڑا۔ کیونکہ کوئی شخص چیختا ہوا میری طرف آرہا تھا جسے دیکھکر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔

آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلّاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے قریب سے گذر گئی۔

اسکے دُور چلے جانے پر میں چھپر کی طرف بڑھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھیں۔ میں نے اسے پکارا مگر اس نے جواب دیا۔

اسکی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اسکی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اسکی کسی ہوئی مٹھیوں کو کھولا تو کوئی چیز اسکے ہاتھ سے نکل کر زمین پر بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ اُف اس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ بھگوان معاف کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخن تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تازہ جھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دہشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ صبح صادق کی پر عظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے ڈھلتے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہوئی ہچکیاں لے لیکر چل رہی تھیں۔ پڑوس کا کنواں نہایت حسرتناک لے میں۔

وت نہیں آ فناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار

کی راگنی گاتا ہوا اسکی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اسکی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد رادھا کی حالت روز بروز سنبھلتی گئی۔ رسیلے نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اُسے بچالیا۔ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہوگیا۔ اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی۔ چنانچہ اس پر حسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام ٹھکرؔ پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں ورنہ کسی زمانے میں یہ گاؤں امن کوٹ کا ہی ایک حصہ تھا اور نیا امن کوٹ کہلاتا تھا۔"

۶

رسیلے کے صبرو استقلال۔ پاکیزہ عشق اور بہادری کی انوکھی داستان سنکر میں نقشِ حیرت بن گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا کمزور چاند، گرد و نواح

میں اپنی روکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک لخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھانجھ بجاتا ہوا اُٹھا اور بلند ہو کر کھجوروں کی دراز چوٹیوں سے ٹکرایا تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبانِ بے زبانی سے۔

وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار

کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پر درد گونج پیدا ہو گئی عین اسی وقت کسی صحرا نشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سنکر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ آزردہ حالی سے میرا دماغ معطل ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

(کتبہ محمد دین کپور تھلوی)